بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(نومبر ۲۰۰۶ء)

اقبال ریویو

پروفیسر سید سراج الدین نمبر

جلد (۱۵) شمارہ (۲)

ISBN.81-86370-31-5

مجلس مشاورت

ا۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد

(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)

مجلس ادارت

ا۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر

(نائب صدر اکیڈیمی)

۲۔ سید امتیاز الدین۔ایڈیٹر

(معتمد اکیڈیمی وایڈیٹر)

بدل اشتراک

فی شمارہ ۵۰ روپے ایک سال (دو شمارے) ۹۰ روپے

بیرونی ملک فی شمارہ ۵ ڈالر

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ :

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحب ۔حیدرآباد۔500028

آندھرا پردیش (انڈیا)۔فون:66663950

e-mail:ihfiqbal@hotmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد کلیم محی الدین، انجم راہی ''شارپ کمپیوٹر'' محبوب بازار،

چادر گھاٹ حیدرآباد۔۲۔فون:9392427796

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلیشر نے وی جی پرنٹر دلسکھ نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

پروفیسر سید سراج الدین

ولادت: ۳۰ر جون ۱۹۲۳ وفات: ۱۵ر جولائی ۲۰۰۶ء

فہرست

عنوان	مضمون نگار	صفحہ نمبر
۱۔ اداریہ	سید امتیاز الدین	۷
۲۔ پروفیسر سید سراج الدین کی یاد میں	مجتبیٰ حسین	۹
۳۔ سید سراج الدین کی یاد میں	شمس الرحمان فاروقی	۱۵
۴۔ پروفیسر سراج الدین۔ شخصیت کے چند پہلو	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	۱۹
۵۔ ہمدم دیرینہ۔ سراج	پروفیسر تقی علی مرزا	۳۱
۶۔ ہم جام بکف بیٹھے ہی رہے۔۔۔	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۳۵
۷۔ اک دیا اور بجھا	پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	۳۹
۸۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ	پروفیسر محمد نعیم الدین	۴۳
۹۔ آہ ! پروفیسر سراج	پروفیسر یوسف کمال	۴۶
۱۰۔ پروفیسر سراج	شاہد حسین زبیری	۵۰
۱۲۔ پاک طینت و پاک باطن پروفیسر سید سراج	قدیر زماں	۵۴
۱۳۔ اُستادِ محترم سید سراج الدین	سلطان لطیف	۶۰

۱۴۔سید سراج الدین شاہ بلیغ الدین ۶۳

○

منظوم خراجِ عقیدت

۱۵۔سراج کی یاد میں شاعر: پروفیسر شیو کے کمار ۶۷
مترجم: علی ظہیر
۱۶۔ایک نظم سید امتیاز الدین ۶۹

○

پروفیسر سراج صاحب کے مضامین (اردو مضامین)

۱۷۔اقبال اور عصری تقاضے ۷۱
۱۸۔پروفیسر صلاح الدین۔ایک تاثر ۷۸

○

۱۹۔پیکر جہد و عمل، (محمد ظہیر الدین صاحب شاہد حسین زبیری ۸۲
نو منتخب صدر اقبال اکیڈیمی کا خاکہ)
۲۰۔اقبال اکیڈیمی کا خبر نامہ ۸۷
انگلش سکشن: صفحات۔ 1 -to- 45

(ٹائٹل پر پروفیسر سید سراج الدین کا عکس تحریر)

○○○○

سید امتیاز الدین

اداریہ

ہر بار جب اقبال ریویو ترتیب و اشاعت کے مرحلوں سے گزر کر سرپرستوں اور قارئین کی خدمت میں بھیجے جانے کی منزل میں ہوتا ہے تو ہم ایک گونہ مسرت اور اطمینان کی کیفیت سے گزرتے ہیں کہ اقبالیات کے سلسلے کی مطبوعات میں حقیر سا ہی کچھ اضافہ تو ہوا۔ لیکن اقبال ریویو کے اس شمارے کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے نہ مسرت کا احساس ہے اور نہ اطمینان کا۔ یہ شمارہ اقبالیات میں اضافہ نہیں بلکہ اقبالیات کے ایک چلتے پھرتے خزانے کے گم ہو جانے کی روداد ہے۔ پروفیسر سید سراج الدین جو اقبال اکیڈیمی کے صدر، انگریزی کے پروفیسر، اردو اور فارسی، انگریزی ادب کے ماہر یوروپی زبانوں مثلاً اطالوی، فرانسیسی اور جرمن کے آشنا، ماہر اقبالیات انکسار کا پیکر، نام و نمود اور شہرت سے بے نیاز ہستی تھے مختصر سی علالت کے بعد 15/جولائی 2006ء کو ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس شمارے میں ہم نے سراج صاحب کے دوستوں، مداحوں اور عقیدت مندوں کے تاثرات اور مضامین شائع کیے ہیں۔ چونکہ سراج صاحب راستباز، منکسر المزاج اور شریف النفس انسان تھے اس لیے اگر تمام مضمون نگاروں کے تاثرات میں کسی قدر یکسانیت دکھائی دے تو اسے سراج صاحب کے کردار و گفتار کی یکسانیت پر محمول کیا جائے۔

ڈاکٹر رحیم الدین کمال، پروفیسر تقی علی مرزا اور سید شاہ بلیغ الدین صاحب پروفیسر سراج الدین کے قدیم رفیقوں میں ہیں۔ تقی علی مرزا صاحب نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ سید شاہ بلیغ الدین صاحب کا سوانحی نوٹ ان کی کتاب ''تذکرہ عثمانین'' سے لیا گیا ہے۔ مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین صاحب، سراج صاحب سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن ان سے بہت بے تکلف تھے۔ مجتبیٰ صاحب کے مضمون میں سراج صاحب کی شخصیت کے دل چسپ گوشوں کی عکاسی ہے۔ جناب شمس الرحمان فاروقی اور سراج صاحب میں ایک طرح کا خصوصی علمی رشتہ تھا۔ سراج صاحب کو ''شب خون'' بہت عزیز تھا۔ اس رسالے میں ان کے مضامین مراسلے اور ان کا ویسٹ لینڈ کا معرکتہ الآرا ترجمہ شایع ہوا تھا۔ شمس الرحمان فاروقی نے

ہماری درخواست پر ایک مختصر مگر جامع مضمون روانہ کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد نعیم الدین سراج صاحب کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ عزیزی جوہی سلمہا سراج صاحب کی بارہ سالہ نواسی ہیں۔ نعیم صاحب کے مضمون اور جوہی کی انگریزی نظم کی شمولیت سے سراج صاحب کے اہل خاندان کی نمائندگی ہوئی ہے۔ پروفیسر شیو کے کمار جو انگریزی کے مشہور شاعر ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں سراج صاحب کے سینئر رفیق تھے۔ شیو کے کمار صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بھی اعتراف کیا تھا کہ سراج صاحب پی ایچ ڈی کے بغیر بھی قابلیت میں یکتا تھے۔ کمار صاحب نے سراج صاحب کی آخری علالت اور ہسپتال کے ایام کو بڑی دل سوزی سے اپنی نظم میں بیان کیا ہے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، قدیر زماں، سلطان لطیف اور پروفیسر یوسف کمال کے مضامین اس بے مثال علمی شخصیت کے لیے موزوں خراج عقیدت ہیں۔ شاہد حسین زبیری کے خاکے کا بیشتر حصہ سراج صاحب کی زندگی میں مکمل ہو چکا تھا۔ خاکہ قریب الختم تھا کہ سراج صاحب کی زندگی کا چراغ بھی گل ہو گیا۔

اس شمارے کے اہم ترین مضامین وہ ہیں جو خود سراج صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان کے بعض منتخب اردو اور انگریزی مضامین کو اس اشاعت میں شامل کیا ہے جن کی شمولیت سے قارئین کو اس مایہ ناز ماہر اقبالیات کی اقبال شناسی اور باریک بینی کا کسی حد تک اندازہ ہوگا۔ سراج صاحب کے انتقال کے باوجود اس شمارے میں بھی ان کی حیات کے نقوش آج بھی تازہ ہیں۔ اسی شمارے میں اگر آپ اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیوں پر نظر ڈالیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جون 2006ء تک بھی جلسوں کی صدارت سراج صاحب نے کی ہے۔

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

☆☆☆

مجتبیٰ حسین

پروفیسر سراج الدین کی یاد میں

انجمن ترقی اردو ہند کے ہفتہ وار رسالہ ''ہماری زبان'' میں ایک مستقل کالم ''اک دیا اور بجھا'' کے عنوان سے شائع ہوتا ہے جس میں ایک ہفتہ کے دوران میں اس دنیا سے رحلت کر جانے والے اردو ادیبوں، شاعروں وغیرہ کے کوائف شائع ہوتے ہیں۔ سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے ہم انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سادہ لوح ملاقاتی نے خلیق انجم سے شکایت کی ''حضور! ہماری زبان کے بعض کالم پابندی سے شائع نہیں ہوتے۔ یہی دیکھئے دو شماروں سے ''ایک دیا اور بجھا'' کا کالم شائع نہیں ہو رہا ہے۔ یہ غلط بات ہے''۔ خلیق انجم نے ہماری طرف معنیٰ خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا ''جناب! اگر اردو کے کسی ادیب یا شاعر کا اس ہفتہ انتقال ہی نہ ہو تو بھلا یہ کالم کیسے شائع ہو سکتا ہے''۔ خلیق انجم کا جواب نہایت معقول تھا۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ محض اس کالم کی پابندی سے اشاعت کی خاطر کسی اردو ادیب کو زبردستی ہلاک کر دیا جائے۔ یوں بھی ان نوں اردو ادیبوں اور شاعروں کی شرح اموات میں اتنا اضافہ نہیں ہوا تھا جتنا کہ آج کل پایا جاتا ہے۔ بہر حال کچھ عرصہ بعد اس شرح اموات میں اِضافہ ہوا تو یہ کالم نہ صرف پابندی سے شائع ہونے لگا بلکہ ''اک دیا اور بجھا'' کے عنوان کے تحت بیک وقت تین چار مرحومین کے کوائف شائع ہونے لگے۔ اک دن ہم نے خلیق انجم سے شکایت کی ''حضور! مانا کہ آپ کا کالم اک دیا اور بجھا اللہ کے فضل سے بڑی پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ اعلان تو اک دیے کے بجھنے کا کرتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو آپ اس والے عنوان کی آڑ میں بسا اوقات چار پانچ دیوں کو ایک ساتھ بجھا دیتے ہیں۔ بھلے ہی اس میں زبان کی کوئی غلطی نہ ہوتی ہو لیکن حساب کی غلطی اور وہ بھی فاش غلطی ہو جاتی ہے۔ لہذا آپ مرنے والوں کی تعداد کے حساب سے عنوان میں حسب ضرورت تبدیلی کر لیا کریں جیسے ''چار دیے اور بجھے''۔ ''تین دیے اور بجھے'' وغیرہ۔ یادش بخیر پطرس بخاری

جب آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل تھے تو ریڈیو پر ایک قوال غالب کی غزل کا مشہور مصرعہ ''قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں'' کو اپنے انداز اور اپنے حساب سے اس طرح گا رہا تھا 'قید وحیات و بند وغم اصل میں دونوں ایک ہیں''۔ پطرس بخاری نے غزل سنی تو ریڈیو اسٹیشن کے ڈیوٹی آفیسر کو فون کر کے کہا ''اس قوال سے کہو کہ وہ مصرعہ کو اس طرح گائے قید وحیات و بند وغم اصل میں چاروں ایک ہیں۔ اگر وہ قید حیات و بند غم گاتا تو ''دونوں'' کا استعمال صحیح تھا لیکن اب جس طرح وہ مصرعہ گا رہا ہے اس میں ''چاروں'' کا استعمال نہایت ضروری ہے، کم از کم ریڈیو سے حساب کی کوئی غلطی نہیں ہونی چاہئے''۔

پطرس بخاری کی یہ بات ہمیں بر سبیل تذکرہ یاد آ گئی ورنہ آج ہم اصل میں اپنے ایک اور کرم فرما کا تعزیتی کالم لکھنے کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں۔ اگر چہ ابھی پچھلے ہفتہ ہم نے صدق دل سے دعا کی تھی کہ اس دنیا سے ہمارے بزرگوں کے اٹھ جانے کا سلسلہ عارضی طور پر ہی سہی رک جائے۔ ہمیں اپنے گناہوں اور خطاؤں کا بخوبی اندازہ ہے اور یہ احساس بھی ہے کہ ہماری دعائیں یوں آسانی سے قبول نہیں ہوتیں مگر کیا کریں بے بس اور لاچار انسان دعا کرنے کے سوائے اور کر بھی کیا سکتا ہے۔

بہر حال ہماری دعا کا انجام یہ ہوا ہے کہ عین **15** جولائی کو، جو اتفاق سے ہمارا جنم دن بھی ہے، ہمارے ایک اور دیرینہ کرم فرما پروفیسر سراج الدین دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہمیں اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ پروفیسر سراج الدین کو ہم نے پہلے پہل کہاں دیکھا تھا۔ قیاس اغلب ہے کہ ہم نے انہیں 1952 یا 1953ء میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں دیکھا تھا جہاں وہ مختصر عرصہ کے لے انگریزی پڑھانے کے لئے آئے تھے لیکن ان سے کبھی انگریزی نہیں پڑھی، نہ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں اور نہ ہی عثمانیہ یونیورسٹی میں۔ کلاسوں کا تعین کرنے والوں نے اس ہوشیاری سے نظام الاوقات کو مرتب کیا تھا کہ ہم جیسے نااہل اور نکمے طالب علم کو پروفیسر سراج الدین کے شاگردوں کے دائرے میں نہ آنے دیا بلکہ ہمیں انگریزی کے ایک اور استاد محسن صاحب کے حوالے کر دیا۔ محسن صاحب وضعدار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ ان کے ایک پاؤں میں ہلکا سا لنگ تھا لہذا خود تو قدرے لنگڑا کر چلتے تھے لیکن ان کی انگریزی خوب چلتی تھی۔ اتنی تیز چلتی تھی کہ ایک مرحلے کے بعد ہم جیسے غبی طالب علم لڑکھڑا جاتے تھے۔ یوں بھی ہم اس زمانہ کے حساب سے اردو میڈیم کے نرے طالب علم تھے اور ہماری خواہش ہوتی تھی کہ

ے کاش محسن صاحب ہمیں اردو میڈیم سے ہی انگریزی پڑھائیں۔ اگر چہ بعد میں ہم نے حسب توفیق انگریزی میں اپنی استعداد ضرور بڑھائی لیکن آج بھی کہیں کہیں ہماری انگریزی میں جولنگ اور مذر لنگ دونوں نظر آجاتے ہیں تو اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ہم اپنے انگریزی کے استاد کی تیز رفتار انگریزی کا ساتھ نہ دے سکے تھے۔ اس وقت ہمیں اس زمانہ کے گلبرگہ کالج کے اور بھی کئی نوجوان شفیق اساتذہ کی یاد آرہی ہے۔ جعفر نظام تھے۔ (جو بعد میں وائس چانسلر بنے) سماجیات کے استاد شیام لال تھے۔ (جو بعض طلبہ کو چوری چھپے کمیونزم کا درس دیا کرتے تھے)۔ ہمیں اس وقت خاص طور پر جناب عبدالمنان کی یاد آرہی ہے جو تھے تو فارسی کے استاد لیکن اردو پڑھانے پر مامور تھے۔ نوجوان تھے لیکن ان کی سنجیدگی، اور بردباری کے آگے بزرگ بھی جھک جاتے تھے۔ بڑے نفیس، شائستہ، کم گو، کم آمیز اور سلیقہ مند انسان تھے۔ اردو ادب اور خاص طور پر کلاسیکی ادب پر انکی گہری نظر تھی ایک بار انہوں نے کلاس روم میں اچانک اقبال کا مصرعہ پڑھا "اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے"۔ پھر طلبہ کو ہدایت دی کہ وہ فی الفور اس مصرعہ اور موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ کلاس ختم ہوئی تو انہوں نے سارے طلبہ کی تحریریں حاصل کرلیں۔ دو دن بعد کلاس روم میں آئے تو با آواز بلند ہمارا نام لے کر پکارا۔ ہم گھبرا کر کھڑے ہوگئے تو بولے "آپ پختہ کار ادیب معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے اسے فی البدیہہ کلاس روم میں بیٹھ کر نہ لکھا ہوتا تو مجھے یہ گمان ہوتا کہ شاید یہ کوئی مطبوعہ تحریر ہے۔ بہر حال میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں"۔ منان صاحب کی شائستگی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کسی مخاطب سے بات کرتے تو اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالنے کی ہمت نہیں کرپاتے تھے بلکہ اپنی نظریں نیچی رکھتے تھے۔ ان کی اس عادت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جتنی دیر وہ ہماری تعریف کرتے رہے ہم شرم کے مارے پسینے میں شرابور ہوتے رہے اور انہوں نے ہماری اس حالت کو دیکھا ہی نہیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ ہمارے لئے کوئی نہ کوئی کتاب لے کر آتے تھے۔ اردو کا بہترین ادب ان ہی کی رہنمائی میں پڑھا۔ زندگی بھر وہ شہرت اور نام نمود سے بے نیاز رہے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور وہ ابھی برسر خدمت ہی تھے کہ دنیا سے چل بسے۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

ہم گلبرگہ سے حیدرآباد آئے تو اس وقت تک پروفیسر سراج الدین بھی عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں آچکے تھے۔ یہاں کا ماحول ہی مختلف تھا اور بات ہی جداگانہ تھی۔ اساتذہ کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی اور ان میں سے بیشتر یوروپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے نئے

واپس آئے تھے۔ان میں سے بعض کا تو رنگ روغن بھی اچھی طرح اترا نہیں تھا۔طالب علموں اور ان کے اساتذہ کے درمیان عمروں کا فرق زیادہ نہ ہوتو اُن کے بیچ عموماً رقابت کے جذبات خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر علی محمد خسرو، پروفیسر سراج الدین اور اسی نوع کے وجیہہ وشکیل اساتذہ ان دنوں ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ ہم نے پروفیسر سراج الدین سے بھی انگریزی نہیں پڑھی البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آرٹس کالج کی راہداریوں میں جب جب ان پر نظر پڑتی تھی تو انگریزی کی نہیں بلکہ انگریز کی یاد آجاتی تھی۔انگریز پانچ چھ سال پہلے ہی ہندوستان کو چھوڑ کر گیا تھا۔چال ڈھال، وضع قطع، عادات واطوار، رہن سہن اور پوشاک کے اعتبار سے سراج الدین بالکل انگریز لگتے تھے (سوائے رنگ کے)۔یوں لگتا تھا جیسے انگریز عجلت میں جاتے جاتے انہیں غلطی سے یہاں چھوڑ گیا ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے سراج الدین صاحب کو کبھی شیروانی میں نہیں دیکھا (شاید شادی کے وقت انہوں نے شیروانی ضرور پہنی ہو لیکن ہم اس وقت اس تقریب میں مدعو نہیں تھے) لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسی گھنی اور بھرپور انگریزیت کے باجود ہم نے کبھی سماجی محفلوں میں انہیں انگریزی بولتے ہوئے نہیں سنا۔اردو میں بات کرتے تھے تو انگریزی کے استاد ہونے کے باوجود اردو میں انگریزی جملوں یا الفاظ کی ملاوٹ نہیں کرتے تھے۔(اگر کسی نے ان کی انگریزی کے استاد ہونے کے باوجود اردو میں انگریزی سنی ہو تو ہمیں بتادے) وہ انگریزی زبان کے ذریعہ کسی دوسرے زبان کی آبروریزی کے مرتکب ہونے کے قائل نہ تھے یوں ہم نے ان سے نہ تو کبھی انگریزی پڑھی اور نہ ہی انگریزی سنی البتہ ان سے سینکڑوں فارسی اشعار سنے جو انہیں زبانی یاد تھے۔سونے پر سہاگہ یہ کہ ان اشعار کو وہ اہل فارس کے خالص بلند ہانگ لب ولہجہ میں سناتے تھے۔یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی نیشاپور، شیراز یا اصفہان سے آئے ہوں۔آپ حیرت کریں گے کہ ان کے انتقال کے بعد اخباری اطلاعات سے ہی ہمیں پتہ چلا کہ وہ 82 برس کے تھے ورنہ ان کی سرگرمیوں سے ہمیشہ یہ مغالطہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی ساٹھ برس کے بھی نہیں ہوئے۔

ابھی ایک سال پہلے ہم نے انہیں نظام کلب کے سامنے ایک بس اسٹاپ پر دوڑ کر بس میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔وہ بے حد چاق وچوبند پھرتیلے اور مستعد انسان تھے۔ہماری دور اندیشی کی داد دیجئے کہ نصف صدی سے بھی بہت پہلے انہیں آرٹس کالج کی راہداریوں میں محو خرام دیکھ کر کہا

تھا کہ یہ حضرت تو اپنی چال ڈھال اور وضع قطع سے بالکل دیوآنند لگتے ہیں اس وقت تو کسی نے ہماری بات پر دھیان نہیں دیا تھا لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا دیوآنند سے ان کی مشابہت عیاں ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آخری زمانہ میں ان کے بعض مخصوص احباب خفیہ طور پر انہیں ''اردو اادب کا دیوآنند'' ہی کہنے لگے تھے۔ ابھی 2 جولائی کی بات ہے ادارہ ادبیات اردو میں شہریار کی سترویں سالگرہ کی تقریب منائی جارہی تھی جس کی صدارت پروفیسر سراج الدین کو کرنی تھی (یہی ان کی زندگی کی آخری محفل تھی) علی ظہیر نے صدارت کے لئے ان کا نام پکارا تو وہ اچھل کر ڈائس پر چلے گئے۔ بعد میں مغنی تبسم کا نام پکارا گیا تو انہیں ڈائس پر چڑھنے میں دشواری پیش آئی لہذا انہیں سہارا دے کا ڈائس پر چڑھایا گیا۔ بعد میں ہمیں بلایا گیا تو ہمارے ساتھ بھی یہ صورتحال پیش آئی اور ہمیں بھی سہارا دیا گیا۔ انہوں نے آہستہ سے کہا ''میاں! تم دونوں عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو۔ پھر بھی ڈائس پر چڑھنے میں تمہیں دشواری پیش آتی ہے''۔ ہم نے کہا ''سراج بھائی! اگر ہمیں بھی تقریب کی صدارت کرنے کے لئے بلایا جاتا تو آپ دیکھتے کہ ہم کس طرح اچھل کر ڈائس پر آتے ہیں''۔ اس کے جواب میں آداب محفل کا لحاظ کرتے ہوئے وہ اپنے قہقہے کو اندر ہی اندر پی گئے۔ اسی کی دہائی کے بعد ہم سراج بھائی سے قریب ہوتے چلے گئے۔ جب بھی حیدرآباد آتے تو ان سے ضرور ملتے تھے۔ ان کی گہری علمیت، بات کرنے کی شائستگی اور ان کے باوقار رکھ رکھاؤ نے ہمیں ان کا گرویدہ بنالیا۔ ماہر اقبالیات کی حیثیت سے پورے برصغیر میں ان کی حیثیت مسلمہ تھی۔ اقبالیات پر ان کی کئی فکر انگیز تحریریں پڑھیں اور بصیرت افروز تقریریں سنیں۔ وہ حیدرآبادی روایات اور اقدار کے سچے علمبردار تھے۔ انکے جانے سے حیدرآباد اپنے ایک بہترین نمائندے سے اور ہم اپنے ایک سچے مشفق اور مہربان سے محروم ہو گئے۔ وہ ہمیں بے حد عزیز رکھتے تھے جس کا اظہار وہ نہ صرف ہماری موجودگی میں بلکہ ہمارے غیاب میں بھی کرتے تھے۔ مغنی تبسم بی نرسنگ راؤ، عبدالقدوس مرحوم، عزیز آرٹسٹ، قدیر زماں، علی ظہیر اور پروفیسر آئزک سکیویرا کی معیت میں ان کے ساتھ گذارے ہوئے لمحے ہمارے لئے سمندر کے بیچ روشن جزیروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی محبت کی گرمی اور باتوں کی نرمی ہمیشہ یاد آتی رہے گی۔

☆☆☆

○

بانگِ درا کی نظموں کو اگر کسی نے نوجوانی میں پڑھا یا بچپن میں سنا ہو تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے، کیوں کہ کسی شاعر کی جو تصویر ذہن میں بنتی ہے، اس میں بہت کچھ اس لمحے یا وقت کو دخل ہے جب کوئی پہلے پہل اس شاعر کو پڑھتا ہے۔ خود میں نے اقبال کی نظموں کو اپنی والدہ سے اس وقت سنا جب مجھے لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ چنانچہ ان کی نرم آواز کا لحن ہمیشہ کے لیے ان نظموں سے اس طرح آمیز ہو گیا ہے کہ اقبال میری متاعِ طفلی کا ایک اہم حصہ بن گئے ہیں۔ غالباً اسی لیے جب کوئی اقبال کے لیے علامہ اقبال یا شاعرِ مشرق یا ترجمانِ حقیقت کے القاب استعمال کرتا ہے تو میرے اندر چھپا ہوا بچہ ان خطابات کو قبول نہیں کرتا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں ایک ایسے شاعر کے لیے جس نے ''پرندے کی فریاد'' اور ''بچے کی دعا'' لکھی ایسے ثقیل بول استعمال کیے جا رہے ہیں۔ اس کو وہ راتیں یاد آتی ہیں جب وہ پہروں چاند کو بادل سے گذرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا اور اسے اقبال کا یہ شعر نصیب تھا:

تکتے رہنا ہائے وہ پہروں تلک سوئے قمر
وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اس کا سفر۔

(پروفیسر سید سراج الدین)

☆☆☆

شمس الرحمان فاروقی
نایب صدر نشین قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

سید سراج الدین کی یاد میں

سراج الدین صاحب سے میری پہلی ملاقات حیدرآباد میں جشن اقبال کے دوران ہوئی تھی۔ یا شاید اس سے پہلے حیدرآباد کے ایک جلسے میں جس کے بانی مغنی تبسم تھے اور جس میں مغنی تبسم کی فرمائش پر میں نے وضعیات (یعنی بعض لوگوں کی اصطلاح میں ساختیات' اور انگریزی میں (Structuralism) پر ایک طویل تقریر کی تھی۔ سراج الدین صاحب بطور صدر رونق افزائے محفل تھے۔ چونکہ میں وضعیات کا کچھ بہت زیادہ قائل نہ تھا' اس لئے میری تقریر میں وضعیات کے بارے میں تعریفی باتیں کم تھیں' تنقیدی زیادہ۔ سراج الدین صاحب چونکہ انگریزی کے آدمی تھے' اور انگریزی میں اس وقت وضعیات کا فیشن سا چل رہا تھا' اس لئے مجھے توقع تھی کہ سراج الدین صاحب کی صدارتی تقریر بیشتر میرے خلاف جائے گی۔ لیکن مجھے تعجب ہوا کہ سراج الدین صاحب نے میری باتوں سے اتفاق کیا۔ اور اتفاق ہی نہیں کیا' انھوں نے اپنی ایک انگریزی نظم سنائی جس میں وضعیات کا خاکہ اڑایا گیا تھا۔ سب لوگ محظوظ ہوئے، میں بھی لطف اندوز ہوا۔ لیکن مجھے سراج الدین صاحب کی یہ بات بطور خاص دلچسپ اور قابل قدر معلوم ہوئی کہ وہ فیشن کی ہوا میں بہنے والوں میں نہ تھے بلکہ وہ اپنے مطالعے اور اپنی صوابدید کی روشنی میں اپنے فیصلے کرتے تھے۔ یہ بات مجھے اس لئے بھی اہم معلوم ہوی کہ اردو میں وضعیات (ساختیات) مابعد وضعیات' اور مابعد جدیدیت کی ہوائیں انگریزی کے شعبوں سے آئی تھیں (اگرچہ انگریزی سے اردو تک آتے آتے وہ اپنی اصل قوت (وہ جیسی بھی اور جتنی بھی تھی) کھو چکی تھیں اور بعض اردو حلقے پھر بھی ان ہواؤں کو اردو ادب کی کھیتی کے لئے مانسونی ہواؤں کی طرح نفع بخش سمجھ رہے تھے۔ ایسے حالات میں سراج لدین صاحب کی رائے بہت نتیجہ خیز ہو سکتی تھی۔

سید سراج الدین کو میں نے ان محفلوں میں کم آمیز مگر خوش مزاج اور نرم خو پایا۔ ان کی

علمیت کا شہرہ مجھ تک پہنچ چکا تھا' لیکن مجھے اس کے بارے میں براہ راست کچھ معلوم نہ تھا۔ جب ان سے رسم وراہ بڑھی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ صحیح معنی میں عالم آدمی ہیں۔ انگریزی کے تو وہ مشاق اور تجربہ کار پروفیسر ہی تھے' فارسی اور اردو میں بھی ان کی دستگاہ عالمانہ تھی۔ اقبال اور غالب سے انھیں خاص شغف تھا۔ فرانسیسی اور اطالوی بھی وہ خوب جانتے تھے۔ پہلی ملاقات کے ایک عرصہ بعد سید سراج الدین نے مجھے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی مشہور نظم The Waste Land کا ترجمہ بھیجا کہ میں اسے ''شب خون'' میں شائع کرنے کے بارے میں غور کروں۔ انھوں نے ایک آدھ باتوں پر مجھ سے مختصر مشورت بھی کی لیکن ترجمہ اس قدر سڈول اور برجستہ تھا' اور اس پر ان کے مختصر حواشی اس قدر معلوماتی تھے کہ داد دیئے ہی بنتی تھی۔ میں نے اسے ''شب خون'' میں شائع کیا اور پھر اسے ''شب خون'' کے آخری شمارے میں شامل کیا' یعنی اس شمارے میں جو ''شب خون'' میں شائع شدہ گزشتہ چالیس سال کی تخلیقات کے انتخاب پر مشتمل تھا۔ اگرچہ بہت پہلے ''شب خون'' میں The Waste Land کا ایک ترجمہ اور بھی شائع ہوا تھا' لیکن مجھے سراج الدین صاحب کا ترجمہ اس سے بہتر معلوم ہوا۔ اور میرا خیال ہے ''شب خون'' کے سب پڑھنے والوں نے اسے بہت پسند کیا۔

سراج الدین صاحب نہ صرف یہ کہ اپنے علم کی نمائش نہیں کرتے تھے' بلکہ وہ صحیح معنی میں منکسر المزاج تھے۔ اور اس سے بڑی بات یہ کہ دوستوں کا لحاظ' اور دوستوں کی خوبیوں کا احترام بھی ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ لہذا وہ دوستوں کی تحریروں کے شائق رہتے اور انھیں کھل کر داد دیتے تھے اور اپنے بارے میں کسی سے کوئی توقع نہ رکھتے تھے۔ یہ وسیع النظری اور پاس مروت اب ہمارے لکھنے والوں میں تقریباً نایاب ہے۔ ایسا نہیں کہ ان کی قدر نہیں ہوئی' یا توقع سے کم ہوئی۔ لیکن ان کی کسی بات سے یہ تاثر نہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ کے متوقع تھے۔ یا جیسا کہ آج کل اکثر لوگوں کا شیوہ ہے' انھیں معاصرین سے ناقدردانی کی شکایت کبھی نہ ہوئی۔ ان میں ایک طرح کی درویشی اور بے نیازی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ سیر چشمی اور فیاضی بھی ان کے مزاج میں بہت تھی۔ ''شب خون'' کی محفلوں میں وہ بہت دیر میں شریک ہوئے' لیکن انھوں نے اکثر کہا' اور لکھا بھی' کہ ''شب خون'' میں اشاعت کے باعث ان کے پڑھنے والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا ہے، خصوصاً شمالی ہند اور بیرون ملک میں زیادہ تر لوگ انھیں ''شب خون'' کے

حوالے سے جانتے تھے، یہ ان کا کہنا تھا، اور میں ان سے ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ آپ کی تحریروں کے باعث علمی حلقوں میں ''شب خون'' کی قدر بڑھی ہے۔

مدت ہوئی قومی کونسل برائے فروغ اردو نے پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم کی مرتب کردہ فرہنگ اصطلاحات ادبی شائع کی تھی۔ اس کے نئے ایڈیشن کی بات اٹھی تو میں نے خیال کیا کہ سید سراج الدین سے درخواست کی جائے کہ وہ اسے نئے سرے سے مرتب کردیں۔ سراج الدین صاحب کی منکسر المزاجی اور ہر کام کو پوری محنت اور دیانت کے ساتھ انجام دینے کی سرشت نے انھیں میری درخواست کو قبول کرنے سے باز رکھا۔ جب میں نے ان سے مکرر اور بزور درخواست کی تو وہ راضی ہوئے لیکن اس شرط پر کہ رحمت یوسف زئی (جنھوں نے ضنائع و بدائع پر اچھا کام کیا ہے) ان کے معاون مقرر کئے جائیں اور سارے کام کی توثیق کے لئے ایک کمیٹی بھی ہو۔ میں جب گزشتہ بار حیدرآباد گیا تو انھوں نے میرے اور رحمت یوسف زئی کے ساتھ بیٹھ کر کام کی ہر ہر جز کی تفصیل پر گفتگو کی تاکہ کہیں کوئی کمی یا غلط فہمی نہ رہ جائے۔ افسوس کہ کام شروع ہونے کے پہلے ہی انھیں مالک حقیقی نے بلالیا۔ اب مجھے دور و نزدیک ایسا کوئی نظر نہیں آتا جو اس کام کو بخوبی انجام دے سکے۔

سید سراج الدین دھان پان اور نازک مزاج سے شخص تھے، لیکن وہ اتنے ہی خوش مزاج اور دوست دار بھی تھے۔ میں خط لکھنے میں نہایت کاہل ہوں لیکن وہ مجھے پابندی سے خط لکھتے اور میری طرف سے جواب میں تاخیر ہوتی تو وہ مطلق شکایت نہ کرتے۔ کچھ دن پہلے جب وہ امریکہ گئے تو انھوں نے مجھے دو لمبے لمبے خط لکھے جن میں امریکہ کی تہذیب اور سیاست پر بھی دلچسپ باتیں تھیں۔ ایک خط کا کچھ حصہ میں نے ''شب خون'' میں شائع بھی کیا تھا۔ وہ ہر خط میں لکھتے کہ یہ سرسری باتیں ہیں، اشاعت کے لئے نہیں ہیں۔ لیکن مجھے ان کے مراسلوں میں ہمیشہ بہت کارآمد باتیں ملتیں اور میں ''شب خون'' کے پڑھنے والوں کو ان میں شریک کر کے خوش ہوتا تھا۔

پچھلی ملاقات میں سراج الدین صاحب ہمیشہ کی طرح خوش مزاج اور نستعلیق اور دوست دار نظر آئے تھے۔ ان کی عمر بہت ہو چکی تھی لیکن وہ اپنی کسی بات سے کسی کو احساس نہ ہونے دیتے تھے کہ ان کی عمر ہستی سے بھی متجاوز ہے۔ ابھی تو ان کے بال بھی پورے سفید نہ ہوئے تھے۔ کہیں سے لگتا ہی نہ تھا کہ ان کا وقت آگیا ہے۔

سید سراج الدین جیسے عالی دماغ، ذی علم، اور کئی زبانوں اور ادبی روایتوں پر پوری طرح حاوی، اور اردو فارسی زبان وادب کے شیدا، اب بھلا کیا پیدا ہوں گے۔ اب تو اردو کے اکثر ادیب اچھی طرح اردو بھی نہیں جانتے۔ میں سید سراج الدین مرحوم کی مغفرت اور بلندی درجات کے لئے بارگاہ حق میں دعا گو ہوں۔

تنہا نہیں ماتم میں ترے شام سیہ پوش

رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

الہ آباد، ۲۴ اکتوبر ۲۰۰۶ شمس الرحمٰن فاروقی

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر رحیم الدین کمال

پروفیسر سراج الدین
شخصیت کے چند پہلو

سراج میرا عزیز دوست تھا۔ ہماری دوستی کم وبیش تین چوتھائی صدی پر محیط تھی۔ اس طویل عرصہ پر محیط دوستی کا احوال دراصل حیدرآباد کی تہذیبی تاریخ دہرانے کے مترادف ہے۔ اس کے لیے نہ تو وقت ہے اور نہ ہی کسی ادبی رسالے میں یہ گنجائش نکل سکتی ہے۔ میں مختصراً، چند واقعات پر اکتفا کروں گا۔ ایسے واقعات جن سے اس کی شخصیت، انداز فکر، زندگی کے رویے پر روشنی پڑتی ہو۔

سراج ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے نانا وحید جنگ تعلقدار تھے۔ اس کے والد گلبرگہ کالج کے پرنسپل تھے۔ اس کے ماموں پروفیسر صلاح الدین جامعہ عثمانیہ کے ممتاز اساتذہ میں شامل تھے۔ اس کے دوسرے ماموں جلال الدین اشک کسی اچھے عہدہ پر فائز تھے۔ شعر و ادب سے دلچسپی کی وجہ سے خاصے مشہور تھے۔ تیسرے ماموں بھی تعلیمی شعبے سے وابستہ تھے۔

سراج کا خاندان اپنے نانا کے گھر رہتا تھا۔ انہوں نے غالباً ایک بڑا باغ لے کر آصف نگر میں گھر بنایا تھا۔ آصف نگر اس زمانے میں شہر کے مضافات میں تھا۔ اس باغ میں آم کے تناور درخت اور ایک بڑی باولی تھی۔ سراج کا زیادہ وقت اپنے بھائی ریاض کے ساتھ جھاڑ بندر کھیلنے میں گزرتا تھا۔

پروفیسر صلاح الدین کو اچھی کتابیں خریدنے پڑھنے اور ایک اچھی لائبریری بنانے کا شوق تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس ماحول نے سراج کے ادبی ذوق کو جلا دی تھی۔

سراج نامپلی ہائی اسکول میں پڑھتا تھا اور میں دارالعلوم میں۔ ہم کھیل کے میدانوں میں، علمی و ادبی محفلوں میں، تقریری مقابلوں میں اور بیت بازی کی نشستوں میں ملتے تھے یا تو خود

حصہ لیتے تھے یا اپنے ساتھیوں کی حمایت کرتے۔ میں نے مسلسل تین سال تک اُردو اور انگریزی کے تقریری مقابلوں کے لیے علی اکبر رولنگ کپ جیتا تھا اور اس طرح رولنگ کپ اسکول کی ملکیت بن گیا تھا۔ سراج بیت بازی کا مردِ میدان تھا۔

ہم دونوں آرٹس کالج میں ایک ساتھ داخل ہوئے۔ اس نے تاریخ کا خصوص مضمون اپنایا اور میں نے معاشیات اپنے لئے چنا۔ لیکن انگریزی کی جماعتیں ایک ساتھ ہوتی تھیں، ہم ان جماعتوں میں ملتے تھے بلکہ ہمیشہ کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک ساتھ بیٹھیں ۔ سنا ہے کہ سراج کا ان کے ایک اور ساتھی عبدالباری صاحب (انھوں نے اورنگ آباد سے پروفیسری سے وظیفہ لیا تھا) کے ساتھ کانٹے کا مقابلہ رہتا تھا۔ ویسے سراج کوئی مقابلہ باز انسان نہیں تھے۔ غالباً نتائج کی وجہ سے ان کے بارے میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی۔ میرے ساتھ سراج کی دوستی کا ڈھنگ الگ تھا جب بھی مل بیٹھتے یا تو کسی مسئلہ پر گفتگو ہوتی یا پھر جو مصرعہ ذہن میں گردش کر رہا ہو اس زمین میں غزل یا نظم تیار ہو جاتی ۔ میں نے مصرعہ کہا اس نے اس پر گرہ لگائی۔ اس نے کوئی شعر پورا کیا میں نے دوسرا شعر جوڑ دیا غرض اس طرح غزل یا نظم مکمل ہو جاتی تھی۔ اس طرح ہماری دوستی کا سلسلہ چلتا رہا۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ مشاعرہ منعقد کرتے تو ایسے دوستوں کے لیے جو شاعر نہیں تھے غزلیں لکھ دیتے تا کہ مشاعرہ کامیاب ہو اور اس کی رونق اور لطف میں اضافہ ہو، افسوس کہ یہ سرمایہ ہم نے کبھی محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔

سراج مزاجاً کوئی جارح aggressive انسان نہیں تھے۔ وہ متین اور خاموش انسان تھے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مسابقت کی مہمیز سے وہ بہت کم اکسائے جاسکتے تھے۔ وہ ایک بے نیاز انسان تھے۔ چنانچہ یونیورسٹی کے چار سالوں میں نہ تو وہ اردو انگریزی مجلوں کی ایڈیٹری کے مقابلوں میں شریک ہوئے اور نہ ہی کسی انجمن کا کوئی عہدہ لیا۔ البتہ وہ اچھے دوستوں کے شیدائی تھے۔ ان کے دوستوں کے بھی کئی حلقے تھے۔ کچھ دوست ایسے تھے جن سے ادبی اور علمی دلچسپی کی وجہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ کچھ دوست ایسے بھی تھے جو سیر و تفریح میں ان کا ساتھ دیتے تھے۔ عمر بھر ان کا یہ رویہ قائم رہا۔ ان کے کچھ دوست ایسے تھے جن سے پکنک اور سیر و تفریح کی بناء پر دوستی قائم تھی یہ گروہ سیر و تفریح کا اہتمام اس طرح سے کرتا تھا کہ دور دور کی تفریح گاہیں بھی ان کی زد سے بچ نہیں سکتیں۔

سراج فقرہ کسنے اور پھبتی اڑانے میں بازی لے جاتے تھے۔ بات میں بات پیدا کرنے کا ان کو ڈھنگ آتا تھا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہمیشہ کھیلتی رہتی تھی۔

بی اے کے بعد سراج نے انگریزی کے ایم اے میں داخلہ لیا اور میں نے معاشیات کے ایم اے میں۔ لیکن مجھے سول سروس کی مسابقت کی طرف ڈھکیلا گیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ملازم ہوئے، شادی کی، چند روز اضلاع کے چکر لگائے اور دوسرے سال صاحبزادہ کی تشریف آوری کے بعد اس معصوم کو ان کی نانی کے حوالے کر کے یورپ چلے گئے اور اس طرح کئی سال تک دیار غیر میں رہے اور سراج سے ملنے ملانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

ایک عرصہ کے بعد جب ہم دونوں (اہلیہ اور میں) مستقلاً حیدرآباد واپس ہوئے اور ایک اکیڈیمی کی بنیاد رکھی تو پھر سراج کے علاوہ دوسرے دوستوں سے بھی ربط قائم ہوا۔ اس اکیڈیمی کی فکری اساس یہ تھی کہ جامعات میں علم کے اتنے خصوصی شعبے قائم ہو گئے ہیں کہ علم ان شعبوں میں بٹ سا گیا ہے۔ اس طرح علم کا کلی تصور غائب ہو گیا ہے۔ اس لیے اس اکیڈیمی کے ذریعہ مختلف علوم کے ماہرین، مختلف پیشوں کے سربرآوردہ افراد اور نوجوانوں کو جنہوں نے تعلیم ختم کر کے زندگی کے کسی نہ کسی شعبے سے وابستہ ہونے کے لیے تیاری کر لی تھی۔ ایک جا جمع کیا جائے تا کہ اس طرح ربط و ضبط اور بحث و مباحثے سے علم کا کلی تصور اجاگر ہو اور مختلف پراجکٹس کا آغاز کیا جائے تا کہ علم و عمل کی خلیج پاٹ دی جا سکے۔ اس اکیڈیمی کا اتنا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ سراج اس اکیڈیمی کے ایک ممتاز رکن تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر نعیم الدین صدیقی، پروفیسر تقی علی مرزا، پرفیسر علی محمد خسرو، حامد علی عباسی، فضل الحق صاحب وغیرہ نے اس اکیڈیمی میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس کے جلسے میرے گھر پر ہوتے تھے۔ سراج نے اکیڈیمی میں بھی سیر و تفریح کی روایت شروع کی تھی۔ ہم نے اس میں پروجکٹ کا اضافہ کیا تھا۔ بقول کسے ایک کام دو کاج ہوں۔

جب ہم تیسری مرتبہ یورپ جانے لگے تو اس اکیڈیمی کی ذمہ داری پروفیسر علی محمد خسرو کے سپرد ہوئی۔ وہ اس کے کنوینر بنے۔ جب ان کو دلی جانا پڑا تو پھر اس اکیڈیمی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ جب ہم پولیس ایکشن کے بعد واپس ہوئے تو حیدرآباد کی بساط ہی الٹ چکی تھی۔

سراج ایک اچھے اور مخلص استاد کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ان کا ہر شاگرد مداح تھا۔ ان کے پڑھانے کا ڈھنگ کچھ ایسا تھا کہ ہر ایک نے اعتراف کیا کہ سراج جیسا اُستاد ملنا مشکل ہے۔

بدقسمتی سے عثمانیہ یونیورسٹی میں بھی پولیس ایکشن کے بعد بیشمار تبدیلیاں آئیں۔ان کو پروفیسری ملنی چاہئے تھی لیکن نہ ملی۔اعتراض یہ تھا کہ انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری نہیں لی تھی۔نعیم الدین صدیقی آکسفورڈ کے ٹرائی پاس تھے اور یہ ڈگری ہندوستان تو ہندوستان خود انگلستان میں قابل قدر سمجھی جاتی تھی۔اس کے باوجود ان کو بھی پروفیسری نہیں ملی۔دوسری ناانصافی یہ ہوئی کہ سراج کو آرٹس کالج سے نکال کر غالباً ایوننگ کالج میں بھیج دیا گیا۔اس سے ان کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ پختہ ذہن اور عمر کے شاگرد ملے اور انہوں نے دل کھول کر اور محنت سے پڑھایا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف اپنے شاگردوں میں مقبول ہوئے بلکہ خود ان طالب علموں نے ان سے بے حد فائدہ اٹھایا اور اپنی ترقی کی راہیں نکالیں۔

میں اس زمانے میں کوئی دس بارہ سال تک حیدرآباد میں مختلف عہدوں پر متعین رہا اور سراج رفتہ رفتہ پوسٹ گریجویٹ ایوننگ کالج کے پرنسپلی پر فائز ہوئے۔وہ ہر روز میرے ہاں دفتر آجاتے۔چائے پیتے، گپ شپ رہتی اور دفتر سے اٹھ کے ان کو ان کے کالج چھوڑتا ہوا میں گھر لوٹتا۔اس زمانے کی خوش گوار صحبتوں کا ذکر بجائے خود الگ موضوع ہے۔

ایک روز مجھے خیال ہوا سراج انتظامیہ کے آدمی تو نہیں پرنسپلی وہ بھی اتنے بڑے کالج کی کس ڈھنگ سے چلاتے ہیں، دیکھ لوں۔ایک شام میں ان کے ہاں پہنچ گیا۔حسب عادت ان کی باچھیں کھل گئیں۔ میں ان کی میز کے ساتھ بیٹھ گیا۔کالج ابھی شروع ہوا تھا۔ ہر شخص آتا مسکرا کر سراج اس کی طرف دیکھتے کسی سے مصافحہ کرتے کسی سے کچھ کہتے۔غرض ہر کسی سے مسکرا کر گفتگو کرتے گویا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان کا کالج ان کی مسکراہٹ کے بل بوتے پر بہ حسن و خوبی چل رہا ہے۔سراج کی زندگی میں حسن معاملت ہمیشہ رہی۔

جب تک وہ یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے انہوں نے ایک اچھے اور مخلص استاد کی حیثیت سے نام پیدا کیا اگر کچھ لکھا بھی تو بہت کم اور جو کچھ لکھا اس میں انہوں نے بہت کم شائع کیا لیکن انہوں نے جو قابل طالب علم تیار کئے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا اس کے اعداد و شمار مہیا نہیں کئے جا سکتے۔

ملازمت ہی کے زمانہ میں انہوں نے پروفیسر صلاح الدین کے بعد اسلامک کلچر رسالے کی ایڈیٹری کے فرائض بھی بحسن خوبی انجام دیئے، یہ عالمی شہرت کا رسالہ تھا اس کے لکھنے والوں

میں عالمی شہرت کے محققین شامل رہے ہیں۔ میں بھی ایڈیٹوریل بورڈ کا رکن تھا۔ اور کئی سال کے اس تعلق سے میں نے کئی کتابوں پر سیر حاصل تبصرے لکھے اور مضامین شائع کئے اس طرح مجھے قریب سے سراج کے کام کے طریقہ کا اندازہ ہوا انہوں نے بڑی محنت اور بڑی مشقت سے اس کے معیار کو قائم رکھا۔ اڈیٹنگ کے جان لیوا کام کو ہنسی خوشی انجام دیا ان کا یہ کام بہت ہی قدر کے لائق ہے۔ لیکن افسوس کے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

سراج کے ملازمت کے زمانہ ہی میں ہاشم علی اختر عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن کر آئے، ان کا میرے نزدیک سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سراج جیسے بے شمار قابل اساتذہ کو جو پروفیسری کے نہ ملنے کی وجہ سے دل برداشتہ ہو گئے تھے (نعیم الدین صدیقی کی طرح ''پائے مرا لنگ نیست، ملکِ خدا تنگ نیست'' کا نعرہ لگا کر دوسرے دیسوں میں ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے) پروفیسری دیکر ان میں ایک نئی جان ڈالدی اس طرح سراج اورتقی بھی پروفیسر بن گئے اور ان کی دیرینہ حق تلفی کی تلافی ہوئی۔

ایک سال قلی قطب شاہ کی تقاریب میں سراج کو تقریر کرنی تھی اس کی بیوی قانتہ نے اپنے ساتھ اس کو شہ نشین سے قریب بٹھالیا تھا خاندان کے دوسرے لوگ بھی ساتھ تھے جلسے کے دوران اس کے چند دوست ملے، ان سے باتیں کرتے کرتے ایک طرف کو نکل گیا جب اس کا نام پکارا گیا تو وہ نہیں آیا۔ دوسری مرتبہ آواز دی تو بھی سراج صاحب غائب۔ مجبوراً اب دوسرے مقرر کی تقریر شروع کر دی گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ کچھ دیر پہلے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا کہاں غائب ہوا، سراج سے ملا تو پوچھا آخر تم غائب کہاں ہو گئے تھے۔ اس نے کہا ایک دوست مل گئے تھے ان سے باتیں کرتے ہوئے ایک طرف جلسہ گاہ کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا، پہلی آواز میں نے سنی نہیں دوسری آواز میں اٹھ کر آرہا تھا کہ دوسرے مقرر نے تقریر شروع کر دی تھی اس لئے میں وہیں بیٹھ گیا قانتہ اس پر برس پڑیں۔ میں نے موقع کی نزاکت دیکھ کر کہا قانتہ یہ تمہارا قصور ہے اس کی تم نے اچھی نظر بندی نہیں کی تھی۔ وہ بچ کر تمہارے ہاتھ سے نکل گیا پھر بھلا وہ تمہارے کہاں ہاتھ آتا اس واقعہ سے سراج کی طبعی بے نیازی کا اظہار ہوتا ہے۔

سراج کا اصل کام اس کے وظیفہ لینے کے بعد شروع ہوا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک اچھے وردیانت دار استاد کی طرح جو طالب علموں کو پڑھایا وہ قابل توقیر نہیں ہے اس کا یہ مطلب بھی

نہیں کہ انہوں نے اسلامک کلچر کو جس ڈھنگ سے چلایا وہ لائق توصیف نہیں۔ یہ سب اس کے قابل قدر کارنامے ہیں لیکن اس نے بہت کم لکھا اور اس سے بھی کم چھپایا۔ اس عرصہ میں اس کو کشمیر جانے کا موقع ملا وہاں اس نے آل احمد سرور صاحب کی سربراہی میں جو کام کیا تھا وہ اقبال پر اس کی کتاب میں شامل ہو گیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس نے وظیفے کے بعد جو کچھ لکھا وہ یقیناً اس کے پہلے لکھے ہوئے سرمایہ سے زیادہ وقیع ہے۔

سراج سے میں اکثر ناراض ہوا کرتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ میری نظر میں وہ کاہل واقع ہوا تھا۔ اس کی قابلیت کا ثبوت اسکی تحریر کردہ مضامین اور کتابوں کے حجم میں ظاہر نہیں ہوتا۔ میں دل میں اس کی کاہلی پر رشک بھی کرتا تھا۔ بیکاری سے جس طرح وہ نباہ کرتا اور لطف لیتا اس کا میں دل سے معترف تھا، لیکن مجھے یہ خیال ستاتا تھا کہ وہ لکھتا کم تھا وہ گھنٹوں خاموش بیٹھ کے دنیا و مافیہا کی سیر کرتا تھا، لیکن اس کے تاثرات صفحہ قرطاس پر نہیں آتے تھے۔ جب وظیفہ لے چکا تو حالات بدل گئے ایک دن ہم دونوں بیٹھ کر گپ شپ کر رہے تھے جانے کیا بات ہوئی اس نے خود چھیڑا۔ کمال بتاؤ، وظیفہ ہو گیا ہے کچھ کام کیا جائے۔ میں نے کہا اگر تم میری بات سننا چاہتے ہو تو میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں تم کو یہ اب اچھا موقع ملا ہے کوئی موضوع چن لو اور اس پر کام کرو اور لکھو ورنہ یہ جو وقت ملا ہے وہ بھی ضائع ہو جائے گا، چند منتخب اداروں میں شریک رہو اور کام کا ایک موضوع نکال لو، سب سے پہلے تو جو کچھ اب تک لکھا ہے اس کو شائع کر دو، خاص طور پر تم نے جو کچھ اقبال پر لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ چھاپا جائے چنانچہ اس نے اس مشورے پر عمل کیا جب کتاب چھپ کر آئی تو پھر ملاقات ہوئی اس کی رونمائی کی تجویز پیش کی اس نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس جلسہ میں تقریر کروں، میں نے کہا میں ایک شرط پر وعدہ کرتا ہوں تم رونمائی کا جلسہ کرو خود اس کے لئے تگ و دو کرو لوگوں کو بلاؤ، دوستوں کو خود رقعے دو۔ یاد دہانی کرو۔ غرض اس نے محنت کی اور ایک بہت اچھا جلسہ اردو ہال میں ہوا۔ میں نے اس کتاب کے حسن و خوبی کے علاوہ اس کتاب کے اسلوب تحریر پر تقریر کی اور جلسہ کامیاب رہا اس کے بعد اس میں اقبال کے جاوید نامے کا فری ورس آزاد ترجمہ کیا۔ اس عرصہ میں وہ جن اداروں سے وابستہ تھا اس کی مصروفیتوں کے علاوہ وہ دوسرے اداروں میں تقریریں شروع کیں صدارت کے فرائض انجام دینے لگا۔ استاد کی حیثیت سے پڑھائے میں اس کو بولنے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ اب اس کو اور جلا ملی۔ اور خاصی اثر آفریں

تقریریں کرنے لگا تھا افسوس کہ اس کا یہ فروغ شمع سحری ثابت ہوا۔ کاش اور چند دن زندہ رہ جاتا۔ ایک اچھا دوست اور ساتھی ختم ہو گیا۔

سراج میرے ساتھ کبھی کبھار دوروں پر بھی چلتا تھا اس کے انتقال کے چند روز پہلے میں نے اس سے کہا کہ چلو ایک کام سے معین آباد چیرولا وغیرہ جانا ہے تمہارا ساتھ رہے گا۔ گپ شپ رہے گی۔ سفر دلچسپ بن جائے گا۔ گرمی کا زمانہ تھا کارایر کنڈیشن تھی لیکن گرمی بھی غضب کی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے لئے کسی پر فضا مقام کی تلاش پر ایک چھوٹی سی امرائی ملی اس میں ایک خوبصورت بنگلہ بھی تھا۔ ہم وہاں کھانے اور ستانے کیلئے ٹھہر گئے، ملازم نے سب انتظام کر دیے حیدر آباد کے انتظامیہ کے عہدے داروں کی روایت قدیم سے چلی آتی ہے دوروں پر جتنے ماتحتین ساتھ ہوتے ان سب کو کھانے میں شریک کر لیتے تھے، اسی مناسبت سے سامان لیجانے کی سہولتیں بھی فراہم کر لی جاتی تھیں۔ اسی زمانے کی چند چیزیں ابھی میرے ہاں باقی رہ گئی ہیں اور جب میں باہر جاتا ہوں تو ان کو ساتھ لیجاتا ہوں غرض ملازم نے ایک طرف دستر خوان چن دیا دوسرے طرف ہوادار جگہ پر فرش کر کے گاؤ تکیہ ستانے کیلئے لگا دیئے جب ہم وہاں پہنچے تو سراج نے یہ انتظام دیکھ کر یہ شعر پڑھا:

منعم بہ دشت وکوہ و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد وبارگاہ ساخت۔

ذہن نے یاوری کی میں نے اس شعر کو معمولی سی ترمیم کیساتھ یوں پڑھا:

صوفی بہ بدشت وکوہ وبیاباں غریب نیست
ہرجا کہ رفت نعرہ زد و بارگاہِ یافت

سراج اس ترمیم پر بھڑک گیا۔ بڑی دیر تک اس کا لطف لیتا رہا اور بار بار کہتا رہا یہ تمہارے حسب حال ہے اور یہ تمہارا ہی حق ہے۔ وہاں سے ہم سراج کی خواہش پر چیوڑلے میں اس مقام پر گئے جہاں پہاڑ پر ڈاک بنگلہ بنا ہوا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حدِ نظر تک ایک خوبصورت منظر لہلہا رہا ہے۔ دھوپ میں منظر کی لہریں بھی کیف پیدا کرتی ہیں۔ منظر کا لطف لیے میں گم تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سراج وارفتہ اس منظر کی طرف بڑھے جا رہا ہے گویا وہ اس سارے منظر کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ یہ پہاڑی میں نشیب و فراز زیادہ تھے۔ مجھے

ڈر ہوا کہ کہیں سراج پھسل نہ جائے۔ بڑی مشکل سے اس کو روکنا پڑا۔ وہ بڑی دیر تک اس منظر کی سرمستی میں گم رہا۔ دوروں میں بھی اس کا یہی حال ہوتا تھا۔ جہاں بھی سرسبز و شاداب لہلہاتے کھیت دیکھتا، کہتا کمال ٹھہر جاؤ ذرا اس کا لطف تو لیں۔ پھر وہ ادھر ادھر کی چوٹیوں پر چڑھ جاتا ایک بچے کی طرح اس خوش گوار ماحول سے کھیلنے لگتا۔

مہدی پٹنم میں ایک بڑا علاقہ فوج کے قبضے میں ہے۔ ہمارے لڑکپن میں ان راستوں سے گزرنے کی اجازت تھی۔ اسی زمانے میں اس علاقے میں سڑکوں کے اطراف درختوں کے پودے لگائے گئے تھے۔ عیدین میں فوج والے اب اس میدان میں نماز پڑھنے اور ان راستوں سے گزرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ہم نے نماز کے بعد سوچا اس سڑک سے گزریں جن پر ہم اپنے لڑکپن میں اکثر گزرتے تھے۔ اب وہاں پودوں کی جگہ تناور درخت کھڑے ہیں۔ میں نے کہا دیکھا سراج یہ درخت کتنے تناور اور سیدھے آسمان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں نے اپنی مثنوی کا یہ شعر سنایا۔

فارغ از پیچ و خمش اندر سفر
گر نگہ بر آسماں روید شجر

سراج کا نہ پوچھو کیا حال ہوگیا۔ وہ درختوں کو چاروں طرف سے پھر کر دیر تک دیکھتا رہا۔ شعر کی تعریف کی۔ تم نے کیا بات پیدا کی ہے۔ شعر کو دہراتا رہا اور درختوں کی طرف دیکھ کر مستانہ وار جھومتا رہا۔ کہنے لگا کیا اچھا ہوا ہم ادھر کی طرف نکل آئے ورنہ یہ درخت ہماری نظروں سے اوجھل ہی رہتے۔

سراج فطرت کے حسن کا شیدائی تھا۔ اچھے اور بلند خیال پر وارفتہ ہو جاتا تھا۔ وارفتگی کے عالم میں اس کا حال ایک بچہ کا سا ہوتا تھا۔ میری صحبت میں وہ خوب کھلتا تھا۔ لیکن جب میں اس کی کاہلی پر ناراض ہو جاتا تو وہ رنجیدہ ہو جاتا لیکن پھر کہتا یار تم سچ کہتے ہو لیکن کیا کروں اس کاہلی میں بھی ایک طرح کا لطف ہے۔ میں اس کے سامنے پہلی مرتبہ اعتراف کیا۔ سراج میں تم سے تمہاری کاہلی اور بے کاری پر ناراض ہو جاتا ہوں۔ لیکن سچ پوچھو تو دل میں تم سے تمہاری اس خوبی پر رشک کرتا ہوں۔ کیا کیا جائے کہ دنیا نے اس کی کوئی قدر معین نہیں کی۔ مجھے بھی اسی مدہوشی کا لطف آتا ہے لیکن تمہیں سے جو تربیت ملی ہے وہ حائل ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ میں نے سراج سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ تم ہر جگہ تقریر کرنے لگے ہو، یہ تو ایک پرفارمر performer جیسا تماشا ہو گیا۔ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ تم پر سستی شہرت کا جادو چل جائے۔ شہرت سے یاد رکھو کہ انسان کی ذات پر ضرب پڑتی ہے۔ اس وقت وہ خاموش ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد جب ملاقات ہوئی تو کہنے لگا۔ کمال تم نے جو بات ذات پر ضرب لگنے کی کہی بہت معقول ہے مگر کیا کیا جائے لوگ آکر مجبور کرتے ہیں۔

سراج نے اظہار بیان کا ایک اچھا اسلوب اپنا لیا تھا۔ گنجلک موضوعات پر بھی تقریر سردست اور اختصار سے کرتا تھا۔ غرض ہم دونوں میں اس طرح کی باہمی تنقید و محاکمہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ جب میں کوئی شعر کہتا تو سب سے پہلے میں اپنی اہلیہ کو سناتا۔ اس کے بعد سراج یا تقی کی باری آتی۔ افسوس کے اب نہ میری اہلیہ رہیں اور نہ سراج۔ تقی اور میں رہ گئے ہیں۔ دیکھیئے کب تک یہ جوڑی چلتی ہے۔

سراج نے T.S.Eliot کی مشہور نظم، Waste Land کا بہت اچھا ترجمہ کیا تھا۔ شب خون کے ایڈیٹر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے ملاقات تھی۔ غالباً ان کو یہ ترجمہ پسند آیا اور شب خون میں چھپا۔ میں چاہتا تھا کہ سراج جاوید نامہ کے ترجمے پر ایک سیر حاصل مقدمہ لکھے اور خاص طور پر اس نکتہ سے بحث کرے کہ دانتے نے یہ اثر حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ سے لیا تھا اور اب اسپین کے اہل علم نے یہ بات تسلیم کر لی ہے۔ اقبال کے سامنے دانتے کی ڈیوائن کامیڈی Divine Comedy کے علاوہ خود فتوحات مکیہ کی ساری روایات تھیں۔ اقبال نے اسلامی منظر کے بجائے مغربی ماحول کی پیروی کی۔ اس طرح ایک اور نکتہ جو قابل غور مجھے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اس نے غالب، طاہرہ اور حلاج کو ارواحِ جلیلہ میں رکھا ہے۔ غالب کی فکری پہنائیوں کے پیش نظر اگر ہم اس کو قبول کر بھی لیں تو طاہرہ اور حلاج کے ارواح جلیلہ میں داخلہ کا کیا جواز ہے۔ حلاج قراطہ کا جاسوس تھا طاہرہ عبدالوہاب یاب کی شیدائی۔ نوجوانوں کو ان سے کیا تاثر مل سکتا ہے؟

سراج نے کہا کہ اس انداز سے لکھنے میں بہت کام کرنا پڑے گا۔ اس وقت یہ ممکن نہیں ہے میں تو اس وقت ایک سیدھا سادھا سا مقدمہ لکھ دیتا ہوں۔

سراج اپنی شاعری کو بھی مرتب کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے یہ کام پورا کیا ہے

یا نہیں۔ بہر حال اس کے یہ سب کام طبع ہونے کے لائق ہیں۔ میں نے اپنی فارسی کلام کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ سراج اس کو دیکھ لیتے افسوس وہ اب نہ رہا۔

سراج ایک شریف انسان تھا۔ اس کا مذاق سلجھا ہوا تھا۔ وہ قلم برداشتہ لکھنے کا نہ عادی تھا نہ ہی قائل۔ وہ سنبھل سنبھل کر لکھتا تھا لیکن خوب لکھتا تھا۔ وہ فلسفہ کی بھول بھلیوں میں پڑنے کا قائل نہیں تھا۔ اس نے اپنی تحریروں میں امکانی حد تک ان مسائل سے گریز کیا۔ ادبی تنقیدی اصولوں پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اچھے لفظ اور خیال کی قدر کرتا تھا۔ فارسی سے اس کو لگاؤ تھا۔ اور فارسی کے ہزاروں شعر اُسے یاد تھے۔ برجستہ شعر پڑھتا تھا۔ لیکن فارسی شعر کہنے کی کبھی اسے ترغیب نہیں ہوئی۔ ہندی زبان کی لچک اور چاشنی خاص طور پر اس کی نسائی جذبات کے اظہار کی موزونیت اور بے پناہ امکانات کا دل سے قائل تھا، لیکن ہندی میں اس نے کبھی طبع آزمائی نہیں کی۔ اس کے انتقال سے چند دنوں پہلے ایک ہندی مصرعہ میرے ذہن میں گشت کر رہا تھا میں نے حسب عادت اس کو یہ مصرعہ سنایا اس نے کہا اس زمیں میں لکھو۔ دوسرے دن میں نے ایک شوخ نظم اس کو ہندی میں سنائی۔ کہنے لگا دیکھو ایک مصرعہ میں کیسی قوت وتوانائی ہے کہ اس نے پھیل کر ایک خوبصورت نظم کی صورت اختیار کر لی ہے۔

سراج کی نجی زندگی کے بارے میں چند جملے لکھنا ضروری ہے۔

ان سے کردار کی استواری، صبر برداشت اور اپنے عزیزوں کے لیے قربانی کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو وہ بہ مشکل ملازمت میں جم سکا تھا۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی معذور تھا۔ دوسرے دو بھائی بھی زیر تعلیم تھے۔ دو بن بیاہی بہنوں اور ایک ضعیف والدہ کی ذمہ داری اس پر آن پڑی تھی۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ جب تک ان ذمہ داریوں سے نمٹ نہ لے شادی نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس کو ان ذمہ داریوں سے نمٹنے میں ایک طویل عرصہ تک جدوجہد کرنی پڑی۔ اس نے شادی میں تاخیر کی۔ کبھی حرف شکایت اس کی زبان پر نہیں آیا۔ اس کی بیوی قانتہ اس سے بھی زیادہ قابل تعریف ہے کہ اس نیک بخت نے سراج کو اپنی ذمہ داریوں سے نمٹنے کا موقع دیا۔ اس کے والد نے مکان کے لئے ایک زمین لی تھی۔ پایہ بھی مشکل سے پورا پڑا نہ تھا۔ اس نے بڑی محنت استقامت سے ان فرائض کو انجام دیا۔ اس کے بعد قانتہ سے جو اس کی خالہ زاد بہن تھی شادی کی۔ بیٹے احتشام الدین جعفر اور بیٹی شہلا کی شادیاں کیں یہ دونوں

امریکہ میں ہیں اور صاحبِ اولاد ہیں۔

سراج نے عمر بھر گاڑی نہیں رکھی۔ میں نے ایک وقت تجویز کی کہ وہ خود کار چلانا سیکھ لے۔ اس نے کہا ایک وقت کار چلانے کا تجربہ کر چکا ہوں۔ گنڈی پیٹ کے تالاب کے کٹے سے موٹر ٹکرادی تھی۔ اکثر وہ میرے ساتھ جاتا جب ہم دونوں کہیں مدعو ہوں۔ جب ماں صاحب تالاب کے بس اسٹانڈ پر پہنچتے تو فوراً ڈرائیور سے کہتا۔ ذرا روکو تو۔ میں اس کو جواب دیتا آپ کمال کے ساتھ ہیں میں آپ کے گھر چل رہا ہوں کہتا یار تم کو زحمت دیتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔ اس کا یہ انداز ہمیشہ ہی قائم رہا۔ لیکن میں اپنے اُصول کا پابند رہا۔

اس کے انتقال سے چند روز قبل ہم دونوں پیاوتی بارہ دری میں مردانگ اور سرود کے پروگرام میں شریک تھے ان دونوں فن کاروں نے اس موقع پر اپنے کمال کا مظاہرہ کیا تھا سچ تو یہ ہے کہ کمال کی آخری سطح چھولی تھی۔ ہم دونوں پر سرور کی کیفیت طاری رہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مردنگ اور سرود کے سرتال ہمارے وجود پر طاری ہو گئے ہیں اور ہم گم صم تھے۔ سارے راستے بہت کم گفتگو ہوئی۔ ایسی ہی بے شمار صحبتوں کی یادیں رہ گئی ہے۔ سراج بڑا پر لطف دوست تھا۔ میرے دوستوں میں میں نے ایک چھوٹا سا حلقہ ان دوستوں کا بنالیا تھا جس میں کوئی نہ کوئی درویشانہ وصف پایا تھا۔ سراج بھی اس گروہ میں شامل تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ہوس، پر فتح پالی تھی۔ زندگی میں کسی چیز کی اس کو ہوس نہیں تھی۔

سراج کو آموں کا بڑا شوق تھا۔ آموں کی تلاش میں وہ دور دور کے چکر کاٹتا تھا۔ امرائیوں سے آم خرید کر لاتا تھا۔ خود کھاتا اور دوستوں کو بھی کھلاتا۔ وقار آباد کے قرب ونواح میں کوئی باغ اس سے نہیں بچا تھا۔ یہ حیدر آبادی تہذیب کی خصوصیت تھی کہ جب کوئی اچھی چیز گھر آتی یا اچھی چیز پکتی تو اس میں سے عزیزوں دوستوں کے لیے حصے جاتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ملازمین کے حصے بھی نکالے جاتے تھے۔ لفظ حصے کے پس پشت یہ تصور تھا کہ یہ کوئی تحفہ نہیں جو دینے والے کی مہربانی سے مل رہا تھا بلکہ دوستوں عزیزوں کا اس میں ایک حق تھا۔ اور اسی طرح دوستوں اور نوکروں کا بھی حصہ شامل تھا۔ اس لئے لفظ حصہ استعمال ہوتا تھا۔ اور حصے بھیجنے کا خاص اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ آم کے موسم میں دوستوں عزیزوں ہی کو نہیں بلکہ ملازمین کو بھی حصے دینے کی روایت عام تھی۔ میں نے حمایت اور کیسری کے منتخب آموں کو ایک ڈبے میں محفوظ کر کے سراج

کے لیے الگ رکھ دئے۔ ان دنوں کچھ مصروفیت ایسی تھی کہ ذہن سے یہ بات نکل گئی۔ چند دنوں کے بعد یکا یک خیال آیا۔ دیکھا تو سب سڑ گئے تھے۔ اس کا مجھے بڑا قلق ہوا۔ یہ آم کے موسم کا آخری زمانہ تھا۔ حمایت اور کیسری کا ملنا دشوار تھا۔ بڑی تلاش کے بعد کچے آم ملے اور میں نے پھر ان کو پیک کروا کر دو چار دن رکھ دیئے تا کہ کم از کم گدرے ہو جائیں۔ جب یہ آم سراج کے ہاں پہنچے تو اس نے کھا کر ان کو بہت ہی خوش ذائقہ پایا۔ ٹیلفیون پر ان آموں کی بڑی تعریف کی۔ لیکن پہچان نہ سکا کہ یہ کیسری اور حمایت تھے۔ حالاں کہ وہ آموں کا بڑا شوقین تھا۔

سراج پکا حیدرآبادی تھا۔ حیدرآبادیوں کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ ''نہیں'' کہہ نہیں سکتے۔ سراج کا بھی یہی حال تھا وہ نہیں کہہ نہیں سکتا تھا۔ ''ہومیاں'' اس کا تکیہ کلام تھا۔ اس کے خالہ زاد بھائی نعیم کا کہنا تھا کہ جب بیماری کے زمانے میں اسے دیکھنے گیا اور حیرت سے پوچھا کہ صرف دو دن کے بخار سے اتنا نحیف کیسے ہوگیا۔ نعیم کا کہنا ہے کہ سراج نے حسب عادت ''ہومیاں'' کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔ پھر اس کے بعد دو روز اور رہا لیکن برائے نام۔ اس کی بیماری بہت مختصر تھی۔ یقین نہیں آتا کہ جو شخص صرف چند دن پہلے اتنا چاق و چوبند تھا اس طرح یکا یک چل بسے گا۔ بہر حال سب کا انجام یہی ہے۔ رہے نام اللہ کا۔ اللہ اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

عجیب آزاد مرد تھا نہ رہا۔

□□□□□

پروفیسر تقی علی مرزا

ہمدم دیرینہ۔ سراج

پروفیسر سید سراج الدین صاحب کے انتقال سے حیدرآباد کی تہذیب، خصوصاً اردو زبان اور ادب کو جو نقصان ہوا ہے، وہ ناقابلِ تلافی ہے۔ گذشتہ پچاس، ساٹھ برسوں میں ان کی شخصیت سب سے زیادہ ممتاز رہی ہے۔ وہ کئی ادبی انجمنوں اور اداروں سے وابستہ تھے اور ان کی جگہ لینے والا مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

سراج الدین مرحوم کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کا زبان سے شغف تھا۔ وہ اردو اور انگریزی کے ماہر تو تھے ہی ، فارسی زبان اور ادب پر بھی ان کی دسترس حیرت انگیز تھی۔ حافظ اور رومی سے ہٹ کر وہ اور شاعروں، جیسے سعدی، عمر خیام، نظیری اور خسرو کے بڑے مداح تھے۔ انہوں نے غضب کا حافظہ پایا تھا اور ان تمام شاعروں کے ہزاروں اشعار انہیں یاد تھے اور اپنی گفتگو اور تحریر میں ان اشعار کو استعمال کرتے تھے۔

سراج صاحب کئی یورپی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ فرنچ اور جرمن کی تعلیم انہوں نے یہیں حاصل کی لیکن اطالوی زبان انہوں نے اٹلی میں حاصلکی جہاں وہ حکومت ہند کی اسکالرشپ پر ایک سال کے لئے گئے تھے۔ انہوں نے دانتے کا بطور خاص مطالعہ کیا اور وہ Divine Comedy بڑی روانی سے اطالوی زبان میں پڑھتے تھے۔ اٹلی میں ایک سال کی قیام نے ان کی فطری صلاحیتوں کو اور بھی اجاگر کیا۔ انہوں نے اطالوی ادب کے علاوہ، اطالوی آرٹ اور کلچر کا بھی بغور مطالعہ کیا۔

مجھے سراج الدین صاحب سے ہمیشہ یہ شکایت رہتی تھی کہ انہوں نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا اور کسی بھی شعبہ کو پوری توجہ نہیں دی۔ مگر ان کی اس صفت کی بناء پر ان پر Dilettantism کا الزام دینا ان کی ہمہ پہلو شخصیت کے ساتھ سراسر ناانصافی ہوگی۔ وہ تو ایک طرح سے Rennaisance man تھے اور بیک وقت تہذیب اور ادب

کے کئی شعبوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ وہ specialization کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ specialization سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ان تمام زبانوں کے، جنکا ذکر اوپر ہوا ہے، کلاسیکی ادب سے واقف تھے جتنا ان کے جدید ادب سے۔ اسلئے وہ بجا طور پر تقابلی تنقید کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اردو کے وہ نقاد بھی تھے اور انشاء پرداز بھی اور شاعری بھی کرتے تھے۔ مگر کبھی بھی مشاعروں میں شرکت نہیں کی اور نہ اپنا کلام طبع کروایا ان کے علم و فضل کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے زعماء ان کی نگارشات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مگر سراج صاحب شہرت اور نام و نمود سے بالکل بے نیاز تھے۔ اور حیدرآبادیوں کی طرح وہ اس فطری تکلف کا شکار تھے جس کے لئے حیدرآباد مشہور ہے۔ انہوں نے کبھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ جب جناب ہاشم علی اختر صاحب جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر بنے تو انہوں نے سراج صاحب سے کئی بار خواہش کی کہ وہ کسی کالج کی پرنسپلی قبول کرلیں۔ سراج صاحب ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ بالآخر ہاشم علی صاحب نے ان کو یہ کہکر راضی کرلیا ''بھائی یہ حیدرآبادی تکلف چھوڑو' اور وہ پوسٹ گریجویٹ کالج کے پرنسپل بنے اور کئی سال اس خدمت پر فائز رہے۔ ہر تہذیبی انجمن ان کو دعوت دیتی تھی کہ وہ کسی کتاب کی رسم اجراء انجام دیں یا کسی ادبی تقریب کی صدارت کریں وہ بادل نخواستہ اس کے لئے تیار ہوتے تھے۔

سراج الدین صاحب کے سوچنے کا انداز بھی ہمیشہ نیا ہوتا تھا۔ وہ گھسی پٹی باتوں کے کہنے کے عادی نہیں تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ گھسے پٹے الفاظ اور انداز تحریر کے استعمال سے بھی گریز کرتے تھے۔ اس وجہ سے انکی گفتگو اور تحریر میں ہمیشہ ایک تازگی رہتی تھی۔ جس کسی نے ان کی تقریر سنی ہے یا تحریر پڑھی ہے، وہ ان کی جدت طرازی کا قائل ہو جاتا تھا۔

ایک اور شعبہ ادب جس میں سراج صاحب کو کمال حاصل تھا، وہ ان کے ترجمہ کے فن میں غیر معمولی قدرت تھی۔ انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی میں ترجمہ تو کرتے تھے، دوسری زبانوں سے بھی انہوں نے کامیاب ترجمے کئے۔ T. S. Eliot کی مشہور نظموں Love Song of Alfred Prufrock اور Waste Land جیسی مشکل نظموں کا لاجواب ترجمہ انہوں نے اردو میں کیا۔ جن اصحاب نے ان نظموں کو انگریزی میں پڑھا

ہے اور انکو سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ سراج صاحب کے ان ترجموں کو پڑھکر حیرت زدہ رہتے تھے کہ انہوں نے کس مہارت سے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ترجمہ کے میدان میں انکی آخری کوشش اقبال کی مشہور فارسی نظم جاوید نامہ کا اردو میں آزاد ترجمہ ہے۔ وہ اس فکر میں تھے کہ کوئی اچھا ناشر اسے شائع کرے۔ میں نے ان سے یہ خواہش کی کہ یہ کام حیدرآباد کی اقبال اکیڈمی انجام دے کیونکہ وہ اس اعزاز کی زیادہ مستحق ہے۔ اس تجویز کو انہوں نے قبول کیا۔ اب اقبال اکیڈمی حیدرآباد، جس کے وہ کئی برسوں تک صدر رہے، کا یہ فرض ہے وہ اس کام کو انجام دے۔

سراج صاحب ہمیشہ اقبال اکیڈمی کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے اور اس کے مالیہ کو مستحکام دینے کی فکر میں رہتے تھے۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ ان کا کتب خانہ، جس کی انہوں نے آخری دنوں میں ترتیب وتہذیب کی تھی، اقبال اکیڈیمی کے حوالے کردیا جائے۔ اس کتب خانے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ صرف انگریزی کتابیں ہیں، بلکہ اردو اور فارسی کتابوں کی بھی خاصی تعداد ہے اور اکثر کتابیں تو ایسی ہیں جو کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔ ان کے ذخیرہ سے اقبال اکیڈیمی کے کتب خانہ کی وقعت بڑھے گی اور سراج الدین صاحب کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

○○○○

اردو غزل اور خود اقبال کی بانگ درا کی غزل کے روایاتی ماحول سے نکل کر بالِ جبریل کی غزل میں قدم رکھیں تو ایسا محسوس ہوگا جیسے گلستان، گل، بلبل و آشیاں کو چھوڑ کر ہم ایک پرشوکت، پرہول، بیاباں میں نکل آئے ہیں جس کا منظر بحر و بر آسماں کی وسعتِ بیکراں، مہر و ماہ اور نجوم کے کارواں سے مرتب ہے۔ اس بے کراں کائناتی منظر کے درمیان انسان تنہا کھڑا ہے اور اس کا نعرۂ بے باک کہساروں کی گونج سے مل کر ایک کائناتی نغمے کی صورت میں ابھرتا ہے۔ یہاں ان نزاکتوں کی گنجائش نہیں جن کی غزل میں اتنی مانگ ہے:

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ سرافیل دل نواز نہیں

(پروفیسر سید سراج الدین)

☆☆☆☆

پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر شعبہ عربی سیفل

ہم جام بکف بیٹھے ہی رہے وہ پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

حیدرآباد کے ادبی علمی اور ثقافتی پروگراموں میں ایک کشیدہ قامت دراز قد شخصیت سے ملاقات ہو جاتی تھی منحنی جسم، روشن اور دراک آنکھیں، سر پر بال برائے نام، لیکن جتنے تھے وہ سلجھے اُلجھے نہیں تھے بلکہ ان میں مشاطگی اور باضابطگی ہوتی تھی، اس سے مزاج کی ربودگی کے بجائے ترتیب پسندی اور سلیقہ مندی کا اظہار ہوتا تھا۔ اقبال اکاڈیمی کے ادبی پروگراموں کی صدارت کے سلسلہ میں ہمیشہ انکا نام آتا تھا۔ صدارتی تقریر ان کی وسیع النظری وسیع المشربی اور ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا ہمیشہ ثبوت ہوتی تھی۔ ایک بار راقم سطور کو اقبال اور عرب دنیا کے موضوع پر اقبال اکیڈمی میں گفتگو کی دعوت دی گئی اس جلسہ کی صدارت بھی ان ہی کی تھی۔ مجھے انہوں نے بتایا تھا کہ سرینگر میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بشیر احمد نحوی نے آپ کی نظم سنائی جو آپ نے انسٹیوٹ میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے قیام کے دوران کہی تھی۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ میں انہوں نے اقبال پر سات لکچر دئے تھے جس سے اقبال کے ساتھ ان کے ذہنی ارتباط اور ذوق وانبساط کا اندازہ ہوتا ہے۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے ان کا میرے پاس ٹیلی فون آیا کہ مجھے بشیر احمد نحوی کا ٹیلفون نمبر چاہئے، میں نے تلاش کے بعد انسٹی ٹیوٹ کا ٹیلفون نمبر دے دیا۔ دوسرے دن پھر ان کا ٹیلیفون آیا کہ اس نمبر سے رابطہ قایم نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس نمبر کئی سال پرانا تھا۔ بہر حال میں نے اپنے ذرایع سے نحوی صاحب کے موبائل کا نمبر حاصل کیا اور انہیں ٹیلیفون کر کے موبائیل کا نمبر دیا۔ انہوں نے بزرگانہ انداز میں شکریہ ادا کیا۔ آج صبح کے اخبار سے سکتہ میں ڈال دینے والی اطلاع ملی کہ ایک ہفتہ پہلے ٹیلیفون سے جس شخصیت سے بات ہوئی تھی وہ کل اس دار فانی سے رحلت کر گئی۔ یہ شخصیت تھی پروفیسر سید سراج الدین کی، جن کی شخصیت ہر جگہ محترم اور جن کی ناقدانہ بصیرت ہر حلقہ میں مسلم تھی، وہ خمخانہ ادب کے رند بلانوش

تھے، ایسے بلانوش جو پی بھی گئے چھلکا بھی گے۔ ان کے جام آتشیں سے جو مئے چھلک گئی وہ سیکڑوں ہزاروں اہل علم وادب کے لئے خمار آگیں اور سرور آفریں بنی۔

پروفیسر سید سراج الدین انگریزی کے استاد اور اردو کے نقاد تھے۔ مشہور انگریزی مجلّہ اسلامک کلچر کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ اردو فارسی اور انگریزی کا ذوق صیقل شدہ تھا۔ اسی لئے ترجمہ کے فن میں بہت کامیاب تھے۔ کامیاب ترجمہ وہ ہے جس میں اصل متن کی روح اور قوت برقرار رہے۔ قرآن مجید کے جتنے اردو ترجمے ہیں ان میں کوئی بھی پورے طور پر کامیاب نہیں۔ اس لئے کہ انمیں صرف مفہوم ہی منتقل ہوسکا ہے قوت منتقل نہیں ہوسکی۔ پروفیسر سید سراج الدین نے عصر کے حاضر کے مشہور ناقد اور شاعر ٹی ایس ایلیٹ کی نظم ویسٹ لینڈ کا ترجمہ کیا جو ادبی حلقوں میں مقبول ہوا، فیض اور غالب اور قلی قطب شاہ کے منتخب کلام کا بھی انہوں نے انگریزی میں ترجمہ کیا اور آخر میں کلامِ اقبال میں جاوید نامہ کا اردو آزاد نظم میں ترجمہ کیا آخری کام ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا۔ اقبال اردو زبان کا سب بڑا شاعر اس اعتبار سے بھی ہے کہ دنیا کی اکثر بڑی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں نکلسن اور آربری اور کیرنن اور خشونت سنگھ اور پروفیسر نعیم صدیقی نے انگریزی میں، اور انا میری شمل نے جرمن زبان میں، اور عبدالوہاب عزام اور صادی شعلان اور موالانا ابوالحسن علی نے عربی میں کلام اقبال کا ترجمہ کیا ہے۔ اردو میں منظوم ترجمہ مضطر مجاز کا ہے۔

اردو کے شاعروں میں اقبال پر جتنا کام ہوا ہے کسی شاعر پر نہیں ہوا۔ غالب پر بھی اتنا نہیں ہوا ہے۔ اقبال پر ایک پورا کتب خانہ وجود میں آچکا ہے۔ مشاہیر اہل قلم نے کتابیں لکھی ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم، یوسف حسین خان، سید عبداللہ، یوسف سلیم چشتی، رئیس احمد جعفری، جگن ناتھ آزاد، عبدالسلام ندوی، مجنوں گورکھپوری کلیم الدین احمد، اسلوب احمد انصاری، شمیم حنفی، عزیز احمد، جاوید اقبال، آل احمد سرور، رشید احمد صدیقی، عبدالمجید سالک، عبدالمغنی، ڈاکٹر وزیر آغا، رضی الدین صدیقی عالم خوندمیری اور اتنے سارے نام ہیں جنہیں حافظہ کی مدد سے گنوانا چاہوں تو گنوا نہ سکوں۔ ایسے میں ماہرین اقبالیات کی صف میں اپنا مقام بنالینا کوئی آسان کام نہیں۔ پروفیسر سید سراج الدین نے اقبالیات پر جو کام کیا اس کی وجہ سے وہ بجا طور پر اقبال اکیڈمی جیسے ادارہ کی صدارت کے مستحق تھے۔ اقبال پر ان کا کام زر کامل عیار اور فکر ونظر کا معیار

قرار پایا۔کلام اقبال کے انہوں نے انگریزی میں ترجمے بھی کئے اور تنقیدی مضامین لکھ کر نئے زاویئے بھی پیش کئے۔ان کی ایک کتاب کا نام ہے مطالعہ اقبال چند نئے زاویئے۔پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ ''پروفیسر سید سراج الدین صاحب نظر بھی ہیں اور صاحب ذوق بھی،انکا اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی ادب کا مطالعہ بہت گہرا ہے اور عالمی ادبیات کے معیاروں سے وہ اچھی طرح واقف ہیں'' اقبال پر سید سراج الدین کی تحریروں کا وزن اسی لئے ہے کہ ایک طرف وہ ادب کے عالمی معیار سے واقف تھے۔انگریزی کے استاد تھے دوسری طرف فارسی کے ذریعہ مشرقی ادب کے سرمایہ پر بھی ان کی نظر تھی۔تیسری طرف اقبال کے ساتھ بچپن سے انکا ذہنی رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ان کی ماں انہیں بچپن میں اقبال کا کلام سنایا کرتی تھیں۔شیرِ مادر کی طرح اقبال کی محبت انکی رگ و پے میں اتر گئی تھی، یہ سہ رخی جہتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اقبال کے ساتھ ایک منصفانہ رویہ قائم کر سکے تھے۔ادب کے عالمی معیار سے تو پروفیسر کلیم الدین احمد بھی واقف تھے لیکن انہیں وہ دوسرے اسباب میسر نہ ہو سکے جنکی وجہ سے انہیں اقبال سے ہمدردی ہوتی۔اور شاعری اردو ادب میں انکی نظر میں اقلیدس کا فرضی نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر رہی۔پروفیسر کلیم الدین احمد کو کلام اقبال کی قوت کا اتنا اندازہ بھی نہ ہو سکا جتنا ایران کے اسکالر علی شریعتی کو ہوا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ایران کے انقلاب میں فکر اقبال کا بڑا حصہ ہے۔اس کے برعکس جمیل مظہری نے کہا تھا کہ ''اقبال کے شاہین سے ہمارا الو بہتر'' فکر اقبال سے ہمدردی نہ ہونے کا اور گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد سے مبالغہ کی حد تک وابستگی کا نتیجہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ زبان قلم سے ادا ہوتے ہیں۔

پروفیسر سید سراج الدین کے مطالعہ اقبال کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے اقبال کا تعارف اس اسلام کے حوالہ سے بھی کرایا ہے جو صرف مسلمانوں کی میراث نہیں بلکہ پورے نظام اقدار کا پاسبان ہے اور جو ساری انسانیت کا ایک ورثہ ہے۔اسلئے اقبال کی شاعری مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے یکساں طور پر اہم اور دونوں کی یکساں دسترس میں ہے۔اسلام کا تصور یہ ہے کہ کرہ ارض کو گہوارہ امن بنا کر ہی انسان آخرت کی پر امن جنت کا مستحق بن سکتا ہے۔اقبالیات کے ماہرین کے زمرہ میں ایسی معتدل مزاج ''خونیں جگرے'' اور ''صاحب نظرے'' قسم کی، وسعت نظر رکھنے والی شخصیتیں کم ملیں گی۔

پروفیسر سید سراج الدین غیر نزاعی اور غیر مختلف فیہ قسم کے انسان تھے اور ایک بہتر انسان کی تمام خصوصیات انکے اندر پائی جاتی تھیں۔ شخصیتیں نزاعی اور اختلافی اس لئے بن جاتی ہیں کہ بہت سے لوگ دوسروں کا احترام نہیں کرتے اور چاہتے یہ ہیں کہ سب انکا احترام کریں۔ ابلیس کو جب آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو اس نے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا (خلقتنی من نار وخلقته من طین) یعنی آپ نے مجھے آتش سے اور اسے خاک سے پیدا کیا ہے۔ دوسروں کا اعتراف نہ کرنے کی یہی شیطانی نفسیات انسانی معاشرہ میں بھی پائی جاتی ہے اور اسی نفسیات کے ہاتھوں حضرت انسان کی قبا سو بار چاک ہوئی ہے۔ پورے تجر علمی کے باوجود انکسار، اعلیٰ منصب کے باجود تواضع، شہرت کی بلندی کے باوجود خاکساری پروفیسر سید سراج الدین صاحب کی خصوصیت تھی۔ وہ شرافت اور شائستگی کا نمونہ تھے۔ ایک حدیث میں آتا ہے تم میں سب سے بہتر انسان وہ ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں۔ انکے انتقال سے صرف اقبالیات کی دنیا میں خلا نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ اخلاقیات کی دنیا میں بھی خلا پیدا ہوا ہے۔ ہم ہر تھوڑے دنوں میں کسی ادیب، کسی مصنف، کسی عالم دین، کسی دانشور کا جنازہ کاندھوں پر اٹھا کر قبرستان پہونچاتے ہیں اور تہذیب کی امانتوں کو زیر زمیں مدفون کر دیتے ہیں۔ اگر مدفون کر دینے کی رفتار اسی طرح باقی رہی اور نئی صلاحیتوں کے جوہر اور گوہر سامنے نہیں آئے اور جودت فکر و قلم کے حاملین شہر خموشاں کے مکین بنتے رہے تو وقت زیادہ دور نہیں جب شہر علم و ادب آباد خرابہ میں اور پر ہجوم ویرانہ میں تبدیل ہو جائے گا۔

○○○○

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

اک دیا اور بجھا

روئیے کن کن کو اور کن کن کا ماتم کیجئے۔ جی ہاں، ابھی ابھی جہاں دار افسر اور افضل محمد کے انتقال کے باعث عام طور پر اور بالخصوص اردو کے ادبی اور تہذیبی حلقوں میں افسردگی اور رنج وغم کی فضاء چھائی ہوئی تھی۔ ان شخصیات کے بچھڑ جانے سے ہونے والی کمی کے تذکرے تھے، ہر طرف دھواں دھواں محسوس ہو رہا تھا کہ پروفیسر سید سراج الدین نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ موت برحق ہے اور موت کا وقت بھی متعین ہے۔ موت وقت پر آتی ہے لیکن جب اچانک کسی کے بارے میں ایسی خبر سننے میں آتی ہے تو لگتا ہے سارے چراغ گل ہو چکے ہیں۔ فضاء تیرہ وتار ہوتی جارہی ہے، ہو چکی ہے۔ سب کچھ اتھل پتھل ہو گیا ہے۔ انسان کا اپنے آپ کو سنبھالنا، سہارنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہو گیا۔ ہم تو یہ نہیں چاہتے تھے، کوئی نہیں چاہتا تھا لیکن کتنی مجبوری، کیسی مجبوری ہے کہ یہ سننا ہی پڑتا ہے، سنے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ چند روز قبل سراج صاحب کی علالت کی اطلاع اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ نمونیہ کا عارضہ۔ کسی مقامی دواخانے میں شریک کیا گیا۔ ایک ثانیہ کے لئے بھی گمان نہیں تھا کہ حالات ایسی کروٹ لیں گے۔ بس یہی خیال تھا کہ معمولی سی بات ہے۔ احتیاطاً دواخانے میں شریک ہوئے ہوں گے۔ چند روز میں گھر آجائیں گے۔ 15 جولائی دوپہر ڈیڑھ دو بجے کا وقت ہوگا کہ میں ادارہ ادبیات اردو پہنچا۔ پروفیسر مغنی تبسم موجود تھے۔ دو، ایک ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے دریافت کرنا چاہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! سراج الدین صاحب کی طبیعت کسی ہے''؟ ''ان کا انتقال ہو گیا''، مغنی صاحب کا جواب تھا۔ مغنی صاحب یوں بھی دھیمی آواز میں گفتگو کرتے ہیں۔ اب تو یہ محسوس ہوا وہ دور، بہت دور سے بات کر رہے ہیں۔ بعد ازاں انہوں نے بتایا، انتقال آج صبح ہوا۔ میں مغنی صاحب کو دیکھتا رہ گیا۔ چند لمحوں تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ دوسرے دن سراج صاحب کی تدفین ہوئی مسجد قطب شاہی سنتوش نگر، مہدی پٹنم سے متصلہ قبرستان میں۔ رہے نام اللہ کا! سراج صاحب بس، آپ اپنی شخصیت کے مالک تھے۔ خاموش، آپ اپنی ذات میں گم۔ دنیا کے ہنگاموں، چیخ وپکار اور شور وشغب سے دور انہوں

نے اپنی دنیا بسا رکھی تھی۔ نام ونمود سے انہوں نے واسطہ نہیں رکھا۔ اقبال اکیڈیمی کے وہ کئی برسوں سے صدر تھے اور ماہنامہ ''سب رس'' کی مجلس مشاورت میں شامل اور ادارے بھی ہوں گے۔ ویسے وہ اور اداروں سے بھی وابستہ ہوں گے لیکن مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی اور سنٹر فار دکن اسٹڈیز کے وہ رکن بھی رہے اور کم وبیش دس برس انگریزی کے معروف جریدہ ''اسلامک کلچر'' کے جنرل ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی انہوں نے کام کیا۔ ان اداروں سے منسلک ہونے کے باعث وہ ان کی تقریبات میں شرکت کرتے۔ زیادہ تر اُن کے حصہ میں صدارت آتی یا وہ کسی نہ کسی طرح اس تقریب کی عزت افزائی کرتے۔ غرض تقریبات کی معزز اور محترم شخصیات میں ان کا شمار ہوتا۔ سراج صاحب کئی زبانوں سے واقف تھے۔ انگریزی، اطالوی، فرانسیسی اور جرمن۔ اور صرف یہی نہیں کہ واقف تھے ان زبانوں کے ادب پر بھی ان کی نظر تھی اور جب وہ تقریر کرتے تو اس کا ثبوت مل جاتا۔ انکی اردو تقاریر میں ان زبانوں کے ادیبوں، شاعروں اور مفکروں کے اقوال، اشعار اور افکار کی جلوہ نمائی رہتی۔ ان کے وسیع علمی افق کا اندازہ ہوتا۔ سننے والوں کی معلومات کا کینویس بھی کشادہ! وہ اپنی بات کو سوچ سمجھ کر اور متعلقہ موضوع پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھتے ہوئے بیان کرتے، کسی الجھاؤ کے بغیر۔ نہایت سادہ، سلیس پیرایہ میں۔ خاص طور پر ادارہ ادبیات اردو میں ان کی کئی تقاریر سننے کا موقع ملا۔ تقریب کے اختتام پر کہنا پڑتا کہ ہاں ہم نے بھی کچھ سنا ہے۔ آج بات کچھ بنی ہے۔ سراج صاحب کے اپنے احباب اور عزیزوں سے مراسم کا مجھے اندازہ نہیں لیکن جب وہ کسی موضوع، کسی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کرتے تو معروضیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ وہ اپنی بات بلا کسی وابستگی کے صاف اور شفاف طریقہ سے کہہ دیتے۔ یہی وہ وصف جس کی وجہ سے باذوق اور شستہ علمی وادبی حلقوں میں انہیں اونچا مقام حاصل تھا۔ شعروادب کے گہرے مطالعے کے باعث ان کی رائے میں جامعیت ہوتی اور یہ رائے ویسی ہی ہوتی جیسی ہونی چاہئے۔ سراج صاحب انگریزی شعروادب کے اپنے مطالعہ کو پوری طرح کام میں لاتے۔ انہوں نے نہ صرف انگریزی میں مضامین لکھے اور کئی مضامین، جن پر انگریزی علمی حلقوں سے انہوں نے داد بھی پائی۔ علاوہ ازیں محمد قلی قطب شاہ، غالب، اقبال اور فیض کی بعض نظموں کے انگریزی میں ترجمے بھی کئے۔ اسی طرح انہوں نے انگریزی کی بعض معروف نظموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ مثلاً ٹی ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کا اردو

ترجمہ لائق ذکر ہے۔اور یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ اردو میں تو شعر کہتے ہی تھے،انہوں نے انگریزی میں بھی شاعری کی۔ظاہر ہے وہ ایسے شاعرانہ مزاج کے مالک نہیں تھے کہ لوگ چاہیں نہ چاہیں اپنے اشعار سنادیں۔سراج صاحب کو اقبال سے ایک خاص شغف تھا۔جیسا کہ وہ اپنی تقریروں وغیرہ میں کہتے بھی تھے۔بچپن میں ان کی والدہ،اقبال کے اشعار انہیں سناتی اور یاد دلاتی تھیں۔اس طرح کم سنی ہی میں انہیں اقبال کے کئی اشعار ازبر تھے۔یہ مزاج ان کا آخر وقت تک رہا۔وہ اقبال کے اشعار موقع بہ موقع سناتے اور فارسی اشعار ہوں تو اسی لہجہ میں۔ان کی اقبال سے دلچسپی ہی کی وجہ سے عثمانیہ یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد،اقبال انسٹی ٹیوٹ،کشمیر یونیورسٹی،سری نگر نے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے انہیں مدعو کیا۔سری نگر میں انہوں نے ایک سمسٹر گزارا،اور اقبال کے افکار اور شاعری پر سات آٹھ لکچر دیئے۔ان کا ایک اہم کام اقبال کے ''جاوید نامہ'' کا آزاد نظم کی صورت میں اردو میں ترجمہ ہے۔یہ ترجمہ تا حال شائع نہیں ہوا۔اس کی اشاعت عمل میں آنی چاہئے۔اقبال کے ان کے گہرے مطالعہ کا ایک اور اظہار ان کی کتاب ''مطالعہ اقبال: چند نئے زاویے'' میں وہ لکچر بھی شامل ہیں جو انہوں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر میں دیئے تیرہ لکچروں اور مضامین پر مشتمل یہ کتاب اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔چند ایک موضوعات ملاحظہ ہوں۔

اقبال غلط فہمی کا شکار: ایک عالمی شاعر،اقبال کی نظم ونثر میں عمرانی تصورات''اقبال کی کلاسکیت اور'' جاوید نامہ کا لینڈ اسکیپ'' عنوانات مجموعی طور پر تنوع کے حامل ہیں۔پروفیسر آل احمد سرور ان لکچروں کے حوالے سے لکھتے ہیں''ان لکچروں کے عنوانات سے ہی سید صاحب کی نظر کی جامعیت اور ان کی ادبی بصیرت کا ثبوت ملتا ہے۔ان عنوانات کے تنوع سے سید سراج الدین کے مطالعہ کی گہرائی اور ان کے ذوق کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے''۔یہ لکچر وغیرہ اپنے موضوعات کے تعلق ہی سے اہمیت نہیں رکھتے لکھنے والے کے رویہ کی ندرت بھی لائق توجہ ہے۔اقبال کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس زاویہ کو اختیار کرنا جو عام طور پر کام میں نہیں لایا گیا ایسی بات کہنا جواب تک بہت کم لوگوں نے کہی یا ایسے زاویے سے بات کہنا جو عام نہیں،آسان نہیں۔یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ لکھنے والوں کے قلم میں گہرائی ہو فکر وفن میں انفرادیت ہو۔سراج صاحب ایسے ہی لوگوں میں تھے اس کتاب کے بعض مضامین خاص طور پر توجہ چاہتے ہیں۔سراج

صاحب نے ''کچھ اس کتاب کے بارے میں'' کے تحت لکھا ہے''۔

اقبال کا اسلام راسخ اور بڑی حد تک متوازن ہے سب سے زیادہ یہ کہ اقبال کے ان سپریشن (Inspiration) کے ولولے اور جوش ان کے انبساط کا مخزن یہی اسلام ہے۔ اسی کے بہت قریب اقبال کی انسان دوستی یعنی (Humanism) ہے اپنے مرشدِ روحانی جلال الدین رومی کی طرح اقبال بھی ''انسانم آرزوست'' کے دلدادہ ہیں انہیں ایک ایسے کردار کی آرزو ہے جو مشرق و مغرب سے آزاد ایک قلندرانہ شان رکھتا ہو اور جس کے مزاج میں درویشی کی نرمی اور وسعت ہو۔ درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اقبال مردِ مجاہد بھی ہے۔ یعنی وہ دوطرح کی تیغ بازی چاہتے ہیں۔

ایک شمشیر و سناں کی اور ایک نگاہ کی (نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا) اقبال اس سطح تک پہنچنے میں بڑی کشمکش سے گزرے ہیں۔ یہ کتاب اقبالیات میں اپنا وزن و وقار رکھے گی سراج صاحب نے اپنے بعض ہم عصروں کے مقابلہ میں زیادہ نہیں لکھا لیکن کمیت پر مت جایئے، کیفیت کے اعتبار سے ان کی کئی تحریروں اور ترجمے آب و تاب کے حامل ہیں۔ ان کی ایسی تحریریں بھی ہوں گی جو ابھی زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو پائیں۔ اُن کے عزیز اور احباب اس خصوص میں توجہ دیں اور ان کی اشاعت عمل میں آئے تو سراج صاحب کی یاد کو باقی رکھنے کا ایک عمدہ اور مناسب ذریعہ ہوگا۔ سراج صاحب نے ایک بھرپور اور کامیاب زندگی گزاری۔ شعر و ادب اور لکھنے لکھانے سے دلچسپی رکھنے والوں کی کمی نہیں لیکن ایسے اشخاص جن کا مطالعہ قدیم و جدید علوم، ادب اور سماجی موضوعات پر وسیع ہو، جو صاحب فکر ہوں جن کی نگاہ معروضیت کی حامل اور تجزیاتی ہو جن کو اسالیب نثر و نشر پر عبور ہو، جن کی تحریریں پڑھنے والوں کے ذہنوں کے در و دریچوں پر دستک دیتی ہوں اور جو سچے اور اچھے انسان اچھے انسان، اچھے دوست! اچھے مشفق ہوں ہمارے معاشرے میں ہیں۔ سراج صاحب کا انہی میں شمار ہوتا ہے وہ اپنی تحریروں، اپنے رویے اور اپنے برتاؤ کے باعث یاد رکھے جائیں گے۔ ان انتقال کیا ہوا، ایک دیا اور بجھ گیا، تاریکی اور بڑھ گئی۔

○○○○

ڈاکٹر محمد نعیم الدین
موظف پروفیسر معاشیات۔عثمانیہ یونیورسٹی

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

سراج صاحب میرے خالہ زاد بھائی تھے۔ بچپن سے لیکر ان کی رحلت تک کوئی 75 سال کا قریبی ساتھ رہا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے بارے میں لکھنا آسان ہوگا۔ اگر آپ کسی سے بہت قریب ہوں اور زندگی بھر کا ساتھ رہا ہو یادوں کے ہجوم سے کچھ یادیں چُننا جو دوسروں کے لیے بھی دلچسپ اور بامعنی ہوں کٹھن کام ہے۔ یہ یادیں اور باتیں اتنی نجی اور شخصی ہوتی ہیں کہ ان میں دوسروں کے لیے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

ہمارا بچپن ایک ہی گھر میں گذرا۔ اس گھر کے اس وقت کے ماحول کی تصویر کشی سراج صاحب خوب کر سکتے تھے۔ یہ گھر وحید منزل کے نام سے جانا جاتا تھا۔ وسیع احاطے میں پھیلا ہوا یہ گھر جس کے آگے اور پیچھے باغ تھا۔ جس میں ہر قسم کے درخت تھے۔ آم کے درخت نیم کے پیڑ جام اور جامن کے جھاڑ اس کے علاوہ گلاب کے تختے۔ ان درختوں کے ساتھ ہمارا بچپن گذرا گھر کا ماحول علمی تھا۔ میرے والد اور سراج صاحب کے والد کا تعلق تعلیمات سے تھا۔ ہمارے ماموں صلاح الدین صاحب جامعہ عثمانیہ میں نفسیات پڑھاتے تھے اور جلال الدین اشک اچھے شاعر اور نثر نگار تھے اور دوسرے ماموں جامعہ عثمانیہ میں زیر تعلیم تھے۔ میری والدہ اور سراج کی والدہ کو اردو کے اساتذہ کے بہت سے شعر اور نظمیں یاد تھیں اور یہ دونوں اپنے بچوں کو یہ نظمیں یاد دلاتی تھیں۔ ہم کو اقبال کی بہت سی نظمیں یاد تھیں سراج صاحب کی اقبال سے دلچسپی غالباً اسی ابتدائی دور کی تربیت کی دین تھی۔ ہمارے ماحول میں تین باتیں اہم تھیں۔ کتابوں سے دلچسپی ادب سے لگاؤ اور نیچر سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت۔ نانا کی وجہ سے صوفیانہ رنگ بھی غالب تھا وہ صوفیانہ رنگ نہیں جو قبر پرستی سکھاتا ہے بلکہ ایک بے نیازی۔ شہرت کی تمنا نہ صلے کی پروا والی

بے نیازی۔ گھر میں ایک طرف صلاح الدین صاحب کی لائبریری تھی جس میں کوئی 5 ہزار کتابیں قرینے سے رکھی گئیں تھیں دوسرے افراد خاندان کے پاس بھی ان کی پسند کی کتابیں تھیں۔ اس ماحول کا سراج صاحب کے کردار اور شخصیت پر بہت گہرا اثر تھا۔

سراج صاحب بڑے Versatile آدمی تھے پڑھنے لکھنے سے لے کر کھیلوں تک وہ ہر میدان میں سب سے آگے رہتے تھے۔ بچپن میں خطاطی سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ بہت عمدہ خطاطی کرتے تھے۔ خطاطی سکھانے والے استاد ان کی بڑی تعریف کرتے تھے ان کی خوش نویسی سے بے حد دلچسپی آخر دم تک قائم رہی۔ اسلامی Calligraphy کے بارے میں انہوں نے دو مضامین بھی لکھے اور ایک T.V پروگرام کا اسکرپٹ بھی لکھا تھا۔

سراج صاحب ایک اچھے نقاد ہی نہیں اچھے شاعر بھی تھے۔ مگر وہ اپنی شاعری سنانے اور اس کو چھاپنے میں بڑا پس وپیش کرتے تھے اس کی ایک وجہ تو انکا انکسار تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ اعلیٰ درجے کی شاعری کیا ہوتی ہے۔ ہمارے اکثر شاعر انہی تیسرے درجہ کی شاعری کو بہت اہم اور اعلیٰ سمجھ کر مشاعروں اور محفلوں میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ سراج صاحب یہ کمزوری خوب سمجھتے تھے اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی اور اٹالین شاعری کے شہ کار ہمیشہ ان کی نظر میں رہتے تھے اس اعلیٰ درجے کی شاعری کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ایک ایسے شخص کے لیے اپنی شاعری کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا شائد دشوار نہیں تھا۔ زبانیں سیکھنے کا سراج صاحب میں بڑا ملکہ تھا وہ ایک سال کے اسکالرشپ پر اٹلی گے (Proveja) پر جایونیورسٹی میں جہاں مختلف ملکوں کے لوگ کئی سال سے اٹالین سیکھ رہے تھے ان کے مقابلے میں سراج صاحب صرف ایک سال پڑھ کر ساری یونیورسٹی میں اول آئے کوئی دوسرا ہوتا تو اس کی خوب تشہیر کرتا مگر یہ بات صرف ان کے بہت ہی قریب کے لوگوں کو معلوم تھی۔ یہ بردباری ان کی شخصیت کا ایک اہم رخ تھی۔ ہندوستان میں اردو والوں میں شاید ہی کوئی ہوگا جس نے ڈانٹے کی Divine Comedy اوریجنل میں پڑھی ہو اس پر حاوی ہو۔ سراج صاحب اس سے لطف اندوز ہوتے تھے مگر اس بات کی تشہیر سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔

سراج صاحب کے نزدیک دوستی ایک اہم قدر تھی وہ دوستوں سے بڑی محبت رکھتے تھے اور دوستی کو عمر بھر نبھاتے تھے وہ کسی دوست کو Drop نہیں کرتے تھے گو کہ بعض وقت ان دوستوں سے انہیں تکلیف ہی کیوں نہ پہنچی ہو دوستوں کی محفل میں وہ بہت پر مذاق رہتے تھے وہ بہت اچھے

converstionalist تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے اس پر چھا جاتے تھے۔ وہ ایک پر خلوص انسان تھے اور انہی خصوصیات کی وجہ سے ہر دل عزیز تھے ان خوبیوں کی وجہ سے ان کی شخصیت بہت پر کشش ہوگئی تھی۔ لوگ ان سے ملنے اور ان سے تعلق رکھنے کے خواہاں رہتے تھے وہ لوگوں کا دل دکھانے سے گریز کرتے تھے اس لیے نا قابل برداشت شاعروں، افسانہ نگاروں اور نام نہاد دانشوروں کو بھی دوست رکھتے تھے۔

سراج صاحب کی ظرافت بڑی اعلیٰ درجے کی تھی وہ مزاحیہ شاعری بھی خوب کرتے تھے قریبی دوستوں کی شادیوں کے موقع پر پُر مزاح نظمیں لکھیں پروفیسر خسرو اور پروفیسر نعیم صدیقی کی شادیوں کے موقعہ پر انہوں نے جو نظمیں لکھیں ان کو تو وہ خود بھول گئے تھے مگر خسرو صاحب کو یاد تھیں اور وہ آخر تک نجی محفلوں میں بڑے مزے لے کر سناتے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ اب کسی کو بھی یاد نہیں۔

سراج صاحب ایک اچھے آرٹسٹ بھی تھے ان کو قدرتی مناظر درخت، پہاڑ، پرانی عمارتوں کی تصویر کشی بڑی پسند تھی ان کی اپنی بنائی ہوئی چند تصاویر کو انہوں نے اپنے دیوان خانے میں لگا رکھا تھا۔ ایک ایسے آدمی کہ جس نے مصوری باقاعدہ نہ سیکھی ہو اتنی اچھی تصاویر بنانا حیرت انگیز تھا۔ ان کی ایک پسندیدہ تصویر ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی پرانی مسجد کی ہے جو انہوں نے بہت پہلے بنائی تھی اور اسکو محفوظ رکھا تھا جسے انہوں نے حال میں فریم کرلیا تھا۔ مناظر سے لطف اندوز ہوتے اور اچھے مناظر سے بہت متاثر ہوتے تھے اور گھنٹوں ان میں گم ہو جاتے تھے۔ حیدرآباد کے اطراف و اکناف کے مناظر اور عام طور پر تلنگانے کے مناظر انہیں بے حد پسند تھے وہ کہا کرتے تھے کہ سویئزرلینڈ کے مناظر بے حد خوبصورت ہیں مگر وہ اتنے Rich ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد آدمی ان سے چھک جاتا ہے ہمارے مناظر سے دل کبھی نہیں بھرتا۔

سراج صاحب کہنے لگے تھے کہ ان کو زندگی سے کوئی شکایت نہیں اور کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ ان کی شخصیت میں کئی رنگ بڑی خوبصورتی سے مدغم ہو گئے تھے ان جیسے انسان کم پیدا ہوتے ہیں ان کو یہ شعر بہت پسند تھا

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

□□□□

پروفیسر یوسف کمال
موظف پروفیسر شعبہ جیالوجی عثمانیہ یونیورسٹی

آہ پروفیسر سراج!

(ایک نذرانہ عقیدت)

۱۵ر جولائی ۲۰۰۶ء پروفیسر سراج الدین صاحب کا حیدآباد کے ایک خانگی دواخانے، میڈی سٹی واقع ٹینک بنڈ میں مختصری علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ پروفیسر سراج نے ۸۲ سال کی عمر پائی۔ ان کی رحلت سے حیدرآباد کی علمی اورادبی زندگی کا ایک عہد (SAGA) تمام ہوا۔ وہ ان اولین (Osmanians) عثمانینس میں سے تھے جنہوں نے علم وادب کی خدمت سے ملک میں ایک مقام حاصل کیا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر تھے، لیکن انہیں انگریزی کے علاوہ اردو، فارسی فرنچ، جرمن اور اطالوی زبانوں میں بھی دسترس حاصل تھی۔ جامعہ عثمانیہ انگریزی ڈپارٹمنٹ میں ۳۷ سال کی درس وتدریس کے بعد ۱۹۸۵ میں وہ وظیفے پر سبکدوش ہوئے تھے۔ جب تک برسرخدمت رہے وہ بڑی حدتک یونیورسٹی علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں سے وابستہ تھے لیکن ۱۹۸۵ میں وظیفے کے بعد وہ حیدرآباد کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں وسیع پیمانے پر فعال ہوگئے تھے۔ حیدرآباد کے مشہور علمی اور تحقیقی رسالے اسلامک کلچر کے ایک زمانے تک مدیر رہے۔ ایوان اردو کے رسالے ''سب رس'' سے تاحیات وابستہ رہے۔'' اقبال اکیڈیمی کے صدر ہونے کی حیثیت سے اقبال ریویو کو بھی انکی سرپرستی حاصل تھی۔

پروفیسر سراج الدین کا ۳۰ر جون ۱۹۲۴ء کو حیدرآباد کے ایک علمی گھرانے میں جنم ہوا۔ گھر میں روایتی طور رار دو، عربی اور فارسی زبانوں کا ماحول تھا۔ ان زبانوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۴۵ء میں نامپلی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۳ء میں ایف۔اے اور ۱۹۴۴ء میں بی۔اے کی تکمیل کے بعد ۱۹۴۶ء میں انگریزی ادب سے ایم۔اے کیا پھر ۱۹۴۸ میں اسی جامعہ میں انگریزی ادب کے استاد مقرر ہوئے۔ انگریزی زبان اورادب پر بے پناہ دسترس کے ساتھ ساتھ انہوں نے جرمن، فرنچ اور اطالوی زبانوں کے

ادب کا بھی غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ گھر کے ماحول اور اس دور کی تربیت کی وجہ سے اردو اور فارسی زبانوں کی کلاسیکی ادبی روایات ان کی گھٹی میں پڑی تھیں۔ وہ مشرقی اور مغربی علوم کی رندی سے سرشار تھے۔ بلاشبہ انکی شخصیت مشرقی اور مغربی ادب کے بہترین روایات کا امتزاج تھی۔ حافظ، سعدی، جامی کے ساتھ ساتھ انہیں اردو ادب کی ساری کلاسیکی شاعری از بر تھی۔ میر، غالب، اقبال، اور فیض تو ان کے پسندیدہ شاعر تھے گفتگو اور تقریروں میں وہ بڑی روانی کے ساتھ ان شاعروں کے کلام کو ''کوٹ'' qoute کرتے رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی شعروادب کے وہ اتنے دلدادہ تھے کہ انگریزی، فرنچ، ہسپانوی سے لے کر اطالوی زبانوں کے شاعروں کی نظمیں ان کی نوک زبان پر تھیں۔ برصغیر کے وہ ان گنے چنے اس کالرز میں تھے جنہوں نے دانتے کی شہرہ آفاق طویل نظم ''ڈیوائن کامیڈی'' (مقدس طربیہ) کا اوریجنل لاطینی زبان میں مطالعہ کیا تھا۔

پروفیسر سراج سے میرے تعلقات ۵۰ رسال پرانے تھے۔ جامعہ عثمانیہ ۱۹۵۷ء میں انہوں نے گراجویشن میں ہم کو انگریزی کی تعلیم دی تھی۔ یہ عثمانیہ یونیورسٹی کا وہ زمانہ تھا جب سائنس فیکلٹی کے طلبا بھی زبانوں کی تعلیم کے لئے آرٹس فیکلٹی جا کر آرٹس کالج میں تعلیم حاصل کرتے تھے مجھے یاد ہے کہ گراجویشن کے سال اول میں انہوں نے جین آسٹن کی مشہور ناول ''پرائیڈ اینڈ پرجیڈس'' (Pride & Prejudice) سال بھر تک بڑے مزے لے لے کر پڑھائی تھی۔ ان کا ہر لکچر جین آسٹن کی زبان و بیان، کردار نگاری اور مکالموں پر ایک بسوط تبصرہ ہوتا تھا۔ دراز انگلیوں اور ہاتھوں کے حرکات وسکنات کے ساتھ بڑے موثر انداز میں مختلف کرداروں کے مکالموں کی شستہ انگریزی میں ادائیگی پر کلاس کو ایک ڈرامے میں بدل دیتی تھی۔ اب ہندوستان کی جامعات میں ایسے Committed استاد ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملیں گے۔ پروفیسر سراج کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ کلاس میں صرف انگریزی میں بات کرتے تھے اور کلاس کے باہر صرف اردو بولتے تھے ۔۱۹۵۹ء میں گراجویشن کے بعد سائنس فیکلٹی کا ہو رہا اور ان سے ملاقاتیں کم کم ہی ہوتی تھیں۔ البتہ حیدر آباد کی ادبی محفلوں میں ان کی شرکت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی جس کی وجہ سے کبھی کبھی ان سے شرف ملاقات بھی حاصل ہو جاتا تھا۔

برسوں بعد جب میں نے ۱۹۹۳ء میں پروفیسر شیو کے کمار ساہیتہ اکیڈیمی، نئی دہلی کے انعام یافتہ انگریزی شعری مجموعہ "Trapfalls in the sky" کا اردو میں ترجمہ بہ عنوان

''آسمان میں کمیں گاہیں'' کر رہا تھا پروفیسر سراج سے بالمشافہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا ایک ایک لفظ اور ایک ایک سطر کے ترجمے کے بارے میں گفتگو سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ربع صدی کے بعد پھر استاد شاگردی کا سلسلہ ایک بار پھر استوار ہوا۔ لگا کہ پھر ان کے علم و فضل اور شفقت کے سوتے ابلنے لگے۔ دو تین سال بعد پھر جب پروفیسر کمار نے راقم الحروف پروفیسر تقی علی مرزا کے ساتھ فیض کے کلام کے تراجم کا شروع کیا تو پھر پروفیسر سے استفادے کا ایک اور موقع ہاتھ آیا۔

خود پروفیسر سراج بڑے کامیاب اور اعلیٰ درجے کے مترجم تھے۔ ان کے تراجم کی فہرست کافی طویل ہے مگر انگریزی کے جدید شاعر ٹی اس ایلیٹ کی مشہور نظم 'ویسٹ لینڈ'' کا اردو میں آزاد ترجمہ بہ عنوان ''ارضِ ویران'' اردو ادب کو ان کی دین ہے۔ علمی اور ادبی کاموں کو انجام دینے میں وہ از حد محتاط رہتے تھے۔ چنانچہ ''ویسٹ لینڈ'' کا ترجمہ انہوں نے کئی سال میں مکمل کیا۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک سطر کو انہوں نے کئی بار بدلا۔ دوستوں اور شاگردوں سے مشاورت کرتے اور ضروری سمجھتے تو نظر ثانی بھی کرتے۔ ''ارض ویران'' معہ تشریحات شب خون میں ۲۰۰۱ میں شایع ہوئی جسے بعد میں شب خون کے انتخاب کی دوسری جلد میں ۱۲۱۲ تا ۱۲۲۱ صفحات، مطبوعہ جون ۲۰۰۵ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ترجمے کے شعبے میں پروفیسر سراج کا دوسرا کارنامہ اقبال کی طویل نظم ''جاوید نامہ'' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ کا فارمیٹ (format) اصل نظم سے مختلف آزاد نظم کا ہے مگر ہے بہت کامیاب۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جاوید نامہ کا ترجمہ اقبال اکیڈمی حیدرآباد سے شائع کیا جا رہا ہے۔

اقبال انسٹیوٹ، سرینگر کے قیام کے دوران پروفیسر سراج نے اقبال کی شاعری کے ادبی محاسن پر حو لکچرز دیئے تھے۔ ان پر نظر ثانی کر کے انہوں نے اسے کتاب کی صورت شائع کیا۔ جس کا عنوان ہے ''مطالعہ اقبال: چند نئے زاویئے'' (۲۰۰۰ء)

پروفیسر سراج نے کبھی بھی باضابطہ شاعری تو نہیں کی مگر گاہے گاہے وہ شعر کہتے تھے اور نجی محفلوں میں بڑے شوق سے سناتے تھے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ان کی شخصیت میں شاعر، ادیب، مترجم، محقق اور استاد کئی پہلو جمع ہو گئے تھے۔

اگرچیکہ وہ مغربی ادبیات کے ماہر تھے مگر فارسی اردو شعری کے رسیا تھے۔ اکثر و بیشتر کہتے

تھے کہ جو بات فارسی اور اردو شاعری میں ہے مغربی شعریات میں کہاں۔ بہ حیثیت انسان وہ خلوص، شفقت اور انکسار کا پیکر تھے۔ موت نے حیدر آباد کی علمی اور ادبی زندگی کو ایک غیر معمولی انسان کے وجود سے محروم کر دیا۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

حیدر آباد کے لئے ۲۰۰۶ء بڑا المناک سال ثابت ہوا ہے۔ پروفیسر سراج الدین کے علاوہ تا حال کئی اہل علم و دانش داغ مفارقت دے گئے جن میں پروفیسر افضل محمد (۱۵ر جون) جاندار افسر اور پروفیسر ایزک سیکورا (۷ ستمبر) شامل ہیں۔ موت کی اس ارزانی پر مجھے ناصر کاظمی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگ آسمان دیکھا نہ جائے

خدا سے دعا ہے کہ وہ جمیع مرحومین کو مغفرت عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

شاہد حسین زبیری

پروفیسر سراج

اگر چھریرا جسم کہوں تو مبالغہ ہوگا لہذا، ایمان کی بات تو یہی ہے کہ دبلا پتلا جسم دراز قد سے کچھ کم اور اوسط سے کافی زیادہ اس قد اور جسامت کے امتزاج کی بدولت کمر میں غیر محفوظ ساخم، عمر دیکھنے میں ساٹھ پینسٹھ کے درمیان مگر حقیقتاً اسی کے پیٹھے میں ان تمام چیزوں کے باوجود ذہنی اور جسمانی اعتبار سے نہایت چاق و چوبند کھڑا ناک نقشہ، گندمی رنگ، بادی النظر میں سر پر بالوں میں کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ (مگر ذرا سا غور کرنے پر بہت آسانی سے پتہ چل جاتا ہے بائیں طرف کے بالوں کو نہ جانے کتنے برسوں کی مشقت سے دائیں طرف تک لانے میں موصوف کو بہر حال کامیابی نصیب ہوئی ہے)۔ فطرت ایسی کہ کسی سے نہ بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بجز ہوا کہ تیز جھونکوں کے ..... ہمیشہ نہایت نیکا تیکھی کا لباس زیب تن کئے یہ دبلا پتلا شخص حیدرآباد کی قد آور ترین شخصیتوں میں شمار ہوتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے انگریزی زبان کے اساتذہ میں وہ چند لوگ جنہیں انگریزی ادب کا امام کہا جا سکتا ہے ان میں ایک نام پروفیسر سید سراج الدین صاحب ہے۔ حالانکہ ان کا تعلق شعبہ انگریزی سے رہا مگر یہ اردو فارسی ادب کا ایک نہایت ہی معتبر نام ہے۔ پروفیسر سراج صاحب جن زبانوں کو بولنے پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے ان میں اطالوی، فرانسیسی اور جرمن شامل ہیں۔ اگر آپ حیدرآباد میں کسی کو بلا تکلف ماہر اقبالیات کہہ سکتے ہیں تو وہ بھی جناب موصوف ہی کی ذات والا صفات ہوگی۔ آپ کا شمار حیدرآباد کے صف اول کے معزز دانشوروں میں بھی ہوتا ہے۔

جہاں ایک طرف ہمارے شہر میں نہایت انکساری اور خاموشی کے ساتھ زندگی گزارنے والے قابل ترین پائے کے علماء، فلسفی اور دانشور موجود ہیں دوسری طرف خود ساختہ اور نام نہاد علماء، فلسفی اور دانشوروں کی بھی کمی نہیں۔ جن کی تقاریر اور مقالوں میں غیر مانوس، ادق، گنجلک الفاظ ناموں اور اصطلاحات کی بھر مار ہوا کرتی ہے۔ جن میں بیشتر الفاظ عام سامع کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔

ان سے پرے وہ لوگ ہیں، جن کا تعلق پہلے زمرے سے ہے اور حقیقتاً یہی وہ قابل ذکر

اشخاص ہیں جن کے دم سے حیدرآباد کی عالمانہ محفلوں کی شان آج بھی قائم ودائم ہے۔حیدرآباد کی اسی علمی کہکشاں کا ایک روشن ستارا سراج صاحب کی ذات ہے جناب والا کے مقالے مضامین اور تقاریر نہایت پر مغز ہوتے ہوئے بھی ہر قسم کے ادق الفاظ اور جملوں سے پاک ہوتے ہیں۔تقاریر کا انداز اور مضامین کا طرز واسلوب نہایت ہی سیدھا سادہ اور دلفریب ہے۔ جو سونے پہ سہاگہ کا اثر کرتا ہے۔

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے (آتش)

جب موصوف اپنے نرم ونازک لہجے میں کچھ سمجھاتے ہیں تو بات دل ودماغ میں اترتی چلی جاتی ہے اگر کسی تقریر میں ضرورتاً کسی ادق لفظ یا فارسی شعر کا استعمال ناگزیر ہوتو اسے اپنا فرض اولین سمجھ کے سمجھانا بھی ضروری سمجھتے ہیں اور یہ انداز آج کی نسل کے سامع کے ذہن کو بوجھل ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔غرض کہ موصوف کی ذات بناوٹ وتصنع سے یکسر مبرّا ہے۔

ذہنی اور جسمانی طور پر نہایت پھرتیلا انسان اپنے ذاتی معاملات میں کہیں کہیں تساہل بھی برتتا نظر آتا ہے۔اس قدر قابلیت اور وسیع مطالعہ رکھنے والا شخص اگر چاہتا تو بیشمار کتابوں کا مولف، مصنف ہو جاتا۔احباب اور چاہنے والوں کے اصرار پر جناب والا کی صرف ایک کتاب ہی منظرِ عام پر آسکی۔یعنی (مطالعہ اقبال، چند نئے زاویے) مگر اپنی جگہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ایک کتاب کا پر مغز مواد صدہا کتابوں پر حاوی ہے۔

اردو ادب کے جہاندیدہ نقاد مرحوم آلِ احمد سرور اس کتاب کے تعلق سے رقمطراز ہیں۔''ان عنوانات کے تنوع سے سید سراج الدین کے مطالعہ کی گہرائی اور ان کے ذوق کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے مجھے یقین ہے کہ ان مضامین کی اشاعت سے اقبالیات کے مطالعہ میں قرار واقعی مدد ملے گی۔میں اس مجموعے کو اقبالیات کے سرمایہ میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھتا ہوں۔سید صاحب کی تحریر رواں اور شگفتہ ہے اور وہ علمی مسائل کو خاصی بے تکلفی کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں''۔

نہ جانے کتنے طلبہ نے ان گنت جلسوں کی طوالت محض اس لئے برداشت کی کہ وہ جانتے تھے کم از کم اختتام جلسہ پہ سراج صاحب کے صدارتی ارشادات میں ہمیں اتنا مواد ضرور مل جائیگا

جو ہمیں خالی ہاتھ لوٹنے کی مایوسی سے بہر حال محفوظ رکھے گا۔

سراج صاحب کے پاس تقریباً سال بھر سے جاوید نامہ کا نہایت عمدہ ترجمہ مکمل ہے۔ علاوہ بریں مختلف موضوعات پر مقالے اور مضامین کثیر تعداد میں غیر مطبوعہ ہیں انہیں ترتیب دے کر کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔ (مزید کئی موضوعات پر مختلف زبانوں سے کئے گئے تراجم جو بیک وقت نثری اور منظوم ہیں)۔ بارگاہ رب لعزت میں میری دعا ہے خداوند کریم انہیں اپنے معاملات میں بھی چستی اور پھرتی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

اس قدر صحت مند سوچ رکھنے والا ذہین اور قابل شخص اگر اپنے آپ کو منظر عام پر لانا چاہتا تو نہ جانے کتنی انجمنوں، اداروں کا سربراہ ہوسکتا تھا۔ بہر حال انسان اپنی فطرت کے آگے بے بس ہے اور یہ انداز تشہیر موصوف کے خمیر میں ندارد رہا مگر جو بھی ذمہ داری جناب پر زبردستی سونپی گئی اسے پوری دیانت داری سے نبھانا اور تکمیل تک پہنچانا آپ کا وصف رہا۔ جناب والا اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی (سری نگر) میں ویزیٹنگ پروفیسر رہے قریب ڈیڑھ دہے سے اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے صدر ہیں۔ اس کے علاوہ سنٹر فار دکھن اسٹڈیز، ادبیات اردو، مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے انتظامیہ کے رکن ہیں اس کے علاوہ بین الاقوامی شہرت یافتہ رسالہ، اسلامی کلچر کے جنرل ایڈیٹر بھی رہے۔

اپنے واقف کار اصحاب کو کبھی نام سے تو کبھی یار اور کبھی دوست کہہ کر بے تکلفی سے مخاطب کرنے والا سیدھا سادہ انسان ذی القدر پروفیسر سراج الدین ہوسکتا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ایک ناواقف آدمی کیلئے قطعی ممکن نہیں۔ اللہ تعالی اپنی مہربانی سے کسی کو اگر ذرا سی کوئی خصوصیت عطا فرمادے تو ابلیس لعین اس شخص کے دل میں شہرت کی خواہش خصوصیت کی مقدار سے کہیں زیادہ پیدا کردیتا ہے مگر سراج صاحب کے ساتھ برسوں گذارنے کے بعد میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس قسم کی خواہش تو کجا کبھی ان میں اس آرزو کی دبی ہوئی چنگاری کا احساس بھی محسوس نہیں ہوا۔

فی زمانہ لوگ بہت سی باتیں دورانِ گفتگو تو کہہ گذرتے ہیں مگر تحریر میں لانے کے لئے جرأت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ جرأت سراج صاحب میں بدرجہ اتم موجود رہی مثلاً اپنی کتاب کے پہلے مضمون بعنوان اقبال غلط فہمی کا شکار ایک عالمی شاعر میں صفحہ چار کے آخری پیراگراف میں رقم طراز

ہیں۔ ''اقبال نے شمال مغربی صوبوں کی خود اختیاری کی جو بات کی اس کو ان محدود معنوں میں فرقہ وارانہ ٹھیرانا جن معنوں میں یہ لفظ تقسیم سے عین قبل اور عین بعد استعمال ہوا اور جن معنوں میں جسٹس چھاگلا نے اسے اقبال کے ضمن میں استعمال کیا وہ جدوجہد آزادی اور اقبال کے افکار دونوں کے سمجھنے میں غلطی اور ناانصافی کا نتیجہ ہے''۔ آپ اگلے پیراگراف میں صفحہ نمبر پانچ کے وسط میں فرماتے ہیں۔ ''اقبال کے افکار سے ذرا سی واقفیت بھی اس بات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ اقبال کے نظریات خودی وقوت اور گاندھی جی کے نظریہ عدم تشدد میں کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی''۔

حیدرآباد سے انگریزی میں شائع ہونیوالی دو نہایت مقبول اور اہم کتابوں کے تعلق سے میں پورے وثوق اور دیانت داری سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کتابوں کی پچھتر فیصدی انگریزی سراج صاحب کے قلم کی مرہون منت ہے اور بچی کچی پچیس فیصد غلط انگریزی کو صد فیصد درست کرنے میں بھی سراج صاحب کا قلم کارفرما رہا مگر ظرف کا یہ معیار کہ کبھی کسی کے سامنے لب کشائی تک نہ کی۔ بقول شاعر ؎

مرے عہد وفا کا خود مرے ہونٹوں پر تالا ہے۔

اپنی سماجی زندگی میں لوگوں سے بے لوث محبت کرنے والا شخص اپنے عزیز و اقارب کو بھی ٹوٹ کر چاہتا ہے مجھے ان کا برسوں پرانا کہا ہوا جملہ آج بھی کل کی طرح یاد ہے جب انہوں نے اپنی بھانجی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا یہ چہیتی بیٹی میری سب سے پیاری دوست بھی ہے ..... میں جب بیٹھا اپنے مضمون کو اختتامی شکل دینے میں مصروف تھا میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ دوسری طرف سراج بھائی اپنی زندگی کی اختتامی جنگ ہارنے کی تیاری میں جٹے ہیں۔ آج صبح ان کے گھر سے کسی کی گلوگیر آواز میں فون پر اطلاع ملی کہ سراج بھائی مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

☆☆☆☆

قدیر زماں

پاک طینت و پاک باطن پروفیسر سید سراج الدین

کوئی شخص مجسم خوبیوں کا حامل ہو تو اس کی کس خوبی کا ذکر پہلے کیا جائے کسی اور کے لئے الجھن کا باعث ہو کہ نہ ہو میرے لئے تو ہے۔

کسی کے لئے سب سے بڑی خوبی مذہبی و روحانی حیثیت ہو سکتی ہے تو کسی اور کے لئے وسیع المشربی۔ میرے لئے کسی شخص کا سب سے بڑا وصف تو اس کا پاک طینت و پاک باطن ہونا ہے۔ جن احباب سے میں برسوں قریب رہا ہوں اور اب ان کے اوصاف کا تقابل کرنا چاہتا ہوں تو جہاں تک پاک باطنی کا معاملہ ہے ان میں مجھے مرحوم سید سراج الدین سرفہرست نظر آتے ہیں۔ اس صفت کے حامل چند اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں لیکن میرا ان سے کوئی ربط نہیں رہا جنہیں میں اس معاملے میں سراج صاحب کا ہم پلہ قرار دوں۔ سراج صاحب کے اس وصف کے بارے میں کسی طرح کا منفی نظریہ رکھنے والا مجھے دور و نزدیک کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ کبھی بھی انہوں نے کسی کی غیبت کی اور نہ کوئی برائی۔ یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات ان کے خیالات سے اختلاف تو کیا جا سکتا تھا لیکن احباب کا ان سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ انکی باتوں میں پھولوں کی خوشبو محسوس کرتے تھے۔ یوں تو سراج صاحب سے کسی مسئلہ پر بحث کرنے کی لوگوں کو نوبت ہی نہ آتی اور اتفاق سے کبھی آجاتی تو وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ ''مجھ سے اختلاف ضرور کرو لیکن خفا مت ہونا'' وہ کون عالم ہے جو دوسروں کی خفگی کو اس خندہ پیشانی سے قبول کرے اور اپنے عجز و انکسار سے بات کو اس طرح ٹال دے کہ مخالف پشیمان ہو جائے۔

آج پروفیسر سید سراج الدین ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی اچانک موت نے حیدرآباد کی علمی اور ادبی محفلوں کو اجاڑ دیا ہے۔ وہ شخص جو ایک بار اسٹیج پر پہنچ جاتا تو اپنے بال و پر درست کرتے ہوئے کوئل جیسی آواز سے سامعین کو محور کر لیتا۔ لوگ اس کے خیالات، اس کے لب و لہجہ اور اس

کے لحن سے محفوظ ہوتے۔ دل ہی دل میں سوچنے لگ جاتے کہ اب تو ہم سیر ہو چکے۔ پھر اس لحن کو تھوڑے وقفہ کے بعد سنیں گے۔ اس کے بعد سامعین اگلی محفل کا انتظار کرنے لگتے۔ جہاں سراج صاحب صدارت کرنے والے ہوتے یا کسی ادبی موضوع پر اظہار خیال۔ خوش الحان پرندے تو اور بھی ہیں لیکن کوئل کی کوک کی مٹھاس ان سب میں کہاں؟ حیدرآباد کی ادبی محفلیں برسوں اس مٹھاس سے سیر ہوتی رہیں۔ کوئل کا تلازمہ میں نے اس لئے منتخب کیا ہے کہ آم کا موسم ہوتا۔ کیری کی کھٹاس کے ساتھ سراج صاحب کے مکان کے پچھلے صحن میں آم کے درخت پر سورج نکلتے سے کوئل منڈلاتی رہتی۔ صبح کسی بھی وقت میں فون کرتا تو ٹیلفون ریسور کے اٹھانے کے ساتھ ہی سراج صاحب کی آواز سے پہلے کوئل کی کوک سنائی دیتی۔ کبھی یہ آواز دوپہر کو بھی سنائی دیتی اور کبھی شام کے وقت بھی۔ ریسور اٹھا کر سراج صاحب پوچھتے ''سن رہے ہو یہ آواز؟'' میں جواب دیتا ''ہاں ہاں! آپ کی آواز میں آواز ملا رہی ہے۔'' جب تک ہماری باتیں فون پر ہوتیں اکثر کوئل کی آواز بھی اس میں ہوتی۔

دراصل پرندوں، درختوں پودوں گملوں اور سبزہ سے سراج صاحب کو بڑی شفقت تھی۔ جن ابتدائی دنوں میں میرا جانا سراج صاحب کے گھر ہوتا صحن میں درختوں اور پودوں کی کمی مجھے کھٹکتی۔ دریافت پر افسوس کا اظہار کیا کہ پانی کا ذریعہ نہ ہونا اس کا سبب ہے۔ چند برسوں بعد بورویل کھدوانے پر جب پانی نکل آیا تو تھوڑے ہی دنوں میں سراج صاحب کے مکان کے سامنے کے اور پچھلے صحن میں پودے ہی پودے نظر آنے لگے۔ ہرے بھرے پتوں کو دکھاتے ہوئے ایسے خوش ہوتے جیسے کسی بچے کے ہاتھوں میں اس کی پسند کا کھلونا دے دیا گیا ہو۔ پودے ذرا بڑے ہوئے اور ان میں پھول کھلنے لگے تو وہ پھولوں کی نشاندہی کرتے پودوں اور پھولوں کی موجودگی میں اسطرح مچلتے اور خوش ہوتے ہوئے انسانوں کو میں نے بہت ہی کم دیکھا ہے۔

اس وصف کا تعلق بھی شاید سراج صاحب کے باطن سے ہے کہ ایسے مناظر کو دیکھ کر ان کے اندر روحانی جذبات جاگ اٹھتے اور انہیں دلی مسرت اور انبساط بخشتے مانسون کے آغاز کے بعد دو ایک بارشیں ہوتیں اور زمین پر سبزہ اُگ آتا تو سراج صاحب کی خواہش ہوتی کہ چلو اب شہر سے باہر چلیں۔ زمین پر گھاس اور سوکھے پیڑوں پر سبز پتوں کو اگتے ہوئے دیکھیں۔ اکثر وہ اپنی جوانی کے دور کی تفریحوں کا ذکر کرتے۔ اپنے کسی خاص دوست کے ساتھ پیدل پیدل شہر

سے دور نکل جارہے ہیں۔ سبزہ اور پھول پتوں کے مناظر سے دل و دماغ کو تر و تازہ کر رہے ہیں روح کو گرما رہے ہیں اور شام ہوتے گھر واپس ہو رہے ہیں۔ نیچر کی کیفیتوں سے اس طرح کی لطف اندوزی نے انہیں ایک اور وصف سے آشنا کیا تھا کسی بھی بے بس اور بے سہارا کو دیکھ کر وہ خاموش نہ رہ سکتے تھے۔ یہی صفت انکے ہم عصر مرحوم پروفیسر عالم خوندمیری میں بھی بدرجہ اتم تھی۔ کم و بیش دونوں ہم عمر رہے۔ عالم صاحب ۱۹۸۳ء میں ۶۱ سال کی عمر میں رحلت کر گئے اور اپنے پیچھے اپنے ہی مزاج کے عالِم کو حیدرآبادیوں کے لئے اپنا جانشین چھوڑ گئے۔ مرحوم کی دعا رہی ہوگی یا اس شہر کے علم و ادب کے پیاسے باسیوں کی تمنا کہ سراج صاحب اپنی آخری سانس سے ایک ہفتہ قبل تک خوش و خرم اور چاق و چوبند رہے۔ ۷/ جولائی کو وہ اور ان کی بیگم صاحب دونوں ایک ساتھ دواخانہ میں شریک ہوئے۔ نمونیہ تشخیص ہوا۔ چوتھے دن سراج صاحب کوما میں چلے گئے تو ۱۵/ جولائی کی صبح انہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیں اور اپنے اقارب دوست واحباب کو سوگوار کر گئے۔

عالم خوندمیری صاحب کے ساتھ ایک واقعہ اس طرح پیش آیا تھا کہ وہ اور میں کار میں سفر کرتے ہوئے عابد شاپ سے گزر رہے تھے۔ سڑک پر انہوں نے دیکھا کہ ایک کانسٹبل ایک رکشہ راں کا گریباں پکڑے اسے گھونسے مار رہا ہے۔ کار رکائی اور فوراً کار سے اتر کر کانسٹبل کے قریب گئے۔ ڈانٹ ڈپٹ کی اور اسے پولیس اسٹیشن لے جا کر اس کے خلاف شکایت درج کروائی۔ سراج صاحب کے ساتھ جو واقعہ پیش ہوا وہ ذرا مختلف ہے لیکن اسی دردمندی کا احساس جس کا مظاہرہ عالم صاحب نے کیا ویسا ہی مظاہرہ سراج صاحب نے بھی کیا بلکہ یہاں خاطی ان کا وہ دوست تھا جس کی کار میں وہ سفر کر رہے تھے۔ سراج صاحب کار کی بائیں سیٹ پر بیٹھے تھے۔ میں کار کو تیزی سے چلاتا ہوا۔ ایک دکان کے پاس رکا پاس میں ایک غریب بڑھیا کھڑی تھی۔ کار کی ٹکر سے نہیں بلکہ اس کی تیز رفتاری سے گھبرا کر وہ زمین پر لڑھک گئی۔ قسمت اچھی تھی کہ اسے کچھ نہیں ہوا ورنہ سراج صاحب اس وقت تک چپ نہیں ہوتے جب تک میں اس بڑھیا کا علاج نہ کرواتا اور ہرجانہ ادا نہ کرتا۔ انہوں نے مجھے ایسی ڈانٹ پلائی کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ یہ چھوٹے سے ناقابل ذکر واقعات ہو سکتے ہیں لیکن ایسے واقعات و حادثات ہی شخصیات کی صفات کو صحیح طور پر اجاگر کرتے ہیں دونوں عالموں کی ایک اور مشترک صفت جس کا پہلے اشارہ کیا گیا

ہے یہ تھی کہ بحث میں کٹ حجتی ہونے نہیں دیتے۔ مخالف اگر زچ کرتا تو عالم صاحب محفل سے اٹھ کر چلے جایا کرتے اور سراج صاحب کی خوبی یہ تھی کہ بڑی خوبصورتی سے بحث کا موضوع بدل دیتے۔ نجی محفلوں کے اختتامی لمحات میں تو وہ اکثر لطیفے سنایا کرتے۔ خود بھی خوب ہنستے اور اہل محفل کو بھی ہنساتے۔ ان لطیفوں کے ساتھ شعر گوئی بھی ہوتی۔

پروفیسر علی محمد خسرو اور پروفیسر رشید الدین خاں، پروفیسر پی وی راج گوپال وغیرہ کے نام ضرور آتے۔ فلسفے کے ایک اور استاد بھی تھے جن کا نام سردار تھا۔ ان کے اکھڑپن کا ذکر مزے لے لے کر کرتے۔ واقعات اس طرح سناتے کہ کوئی قصہ گو اپنے کان کاٹ لے۔ ان کی تقریروں اور اشعار کے حوالوں کے ہم سب گواہ ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ان محفلوں کا کوئی رکارڈ نہ رکھا جاسکا جس میں مرحوم اختر حسن صاحب مرحوم نثار احمد فاروقی صاحب سراج صاحب تقی علی مرزا صاحب، مغنی تبسم صاحب اور چند دیگر احباب شامل رہتے۔ کم از کم ڈھائی تین گھنٹوں تک یہ محفلیں جمی رہتیں۔ اختر صاحب یا نثار احمد صاحب فارسی کا کوئی شعر سناتے تو جواب میں اسی موضوع پر سراج صاحب اپنی یادداشت سے فارسی اور اردو کے کوئی چار چھ شعر سناڈالتے۔ پھر یکے بعد دیگرے اشعار کا سلسلہ چل پڑتا۔ بیچ بیچ میں فکاہیہ اور مزاحیہ باتیں بھی ہوتیں۔ بعض وقت فارسی اشعار کا مفہوم جاننے کی میری خواہش ہوتی تو گفتگو کی روانی میں خلل پڑ جاتا۔

اختر حسن صاحب یا سراج صاحب دو ایک لفظوں کا اشارہ کردیتے۔ پھر محفل کی گرمی جاری رہتی۔ سراج صاحب تمباکو کے عادی تو تھے نہیں لیکن ایسے موقعوں پر دو تین کیوبن سگار اپنے ساتھ ضرور لاتے۔ خود بھی جلاتے اور صاحب ذوق کی نذر بھی کرتے۔ ان محفلوں میں نرسنگ راؤ صاحب اور آئزک سیکویرا صاحب جب موجود ہوتے تو فارسی اردو اشعار کے علاوہ انگریزی شاعری کے بھی حوالے دیے جاتے اور لاطینی زبان کے ساتھ ڈانٹے اور ورجل کا ذکر بھی سراج صاحب بڑے ذوق وشوق سے کرتے۔ ایسے تمام احباب جو ان محفلوں میں شریک رہے ہیں اب ان جیسی محفلوں کیلئے ترستے رہ جائیں گے۔ غنیمت ہے کہ دو چار کنکر ابھی موجود ہیں اب تو ان احباب کی محبتیں تو کم کم ہی نصیب ہوتی ہیں۔ اور پھر مرحومین کی کمی کا احساس تو کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

کئی برسوں پرانی بات ہے سراج صاحب کو میں نے پہلی بار نظام کلب میں دیکھا تھا

بلیرڈس کھیل رہے تھے۔ پائنٹ شرٹ کے اندر منحنی سا جسم جس پر آخری وقت تک کبھی دو ماشے گوشت کا اضافہ نہیں ہوا۔ پھر جب وہ نظام کالج کے پرنسپل تھے تو انکے آفس میں گاہے گاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ عالم خوندمیری صاحب کہا کرتے ایک سراج ہے۔ بڑا اسپارک ہے اس میں ''سوچتا رہتا کہ اس قدر دبلا پتلا پرنسپل ایک بھاری بھرکم کالج کو شاید اپنے اسپارک ہی سے چلا رہا ہوگا۔ لیکن جس اسپارک کا عالم صاحب نے ذکر کیا تھا بہت جلد پتا چلا کہ وہ تو ان کی تقریروں میں ہے۔ انکی فکر میں ہے۔ پہلی بار میں نے ان کی تقریر مرحوم سید ہاشم علی اختر کے کسی تہنیتی جلسے میں سنی تھی۔ میٹھی میٹھی کوئل جیسی آواز۔ جس شخص کو میں نرم و نازک اور کومل کومل سمجھ رہا تھا وہ اپنی پرزور اور پروقار تقریر سے سامعین کو ہمہ تن گوش بنا دے رہا تھا۔ اس کے بعد اردو ہال اقبال اکاڈمی، ادارہء ادبیات اردو کئی جگہ انکی تقریریں علم وادب کے موضوعات پر سنیں۔ کبھی لگتا تقریر اب ختم ہو تو اچھا ہے۔ نہیں یہ جاری رہے یہی مناسب ہے۔ مضائقہ نہیں پوری بات ہوگئی ہے ابھی اطراف واکناف باقی ہے۔ اس سے بھی سیر ہوا جائے۔ موصوف کو سنتے رہنا ہی افضل ہے۔ البتہ ایک بات کھٹکتی رہی کہ انہیں کبھی پڑھتے لکھتے نہیں دیکھا۔ یا تو وہ کسی اسٹیج سے تقریر کر رہے ہیں یا کسی محفل کو اپنی عالمانہ گفتگو سے گرما رہے ہیں۔ اس بات پر بھی حیرت ہوتی کہ دوران تقریر یا دوران گفتگو انہوں نے انگریزی الفاظ کا سہارا نہیں لیا۔ انگریزی پر عبور کا یہ عالم تھا کہ اچھے اچھے استاد پانی مانگیں۔ سینئر اساتذہ بھی ان کی انگریزی عبارتوں کی تصحیح کے قائل تھے۔ ناموزوں الفاظ کی جگہ ایسے الفاظ بٹھاتے کہ وہ انگوٹھی میں نگینہ جیسے لگتے۔ لیکن ہاں انہیں اپنی کابلی پر بڑا ناز تھا۔ بڑی منت وسماجت پر ہی وہ کسی کام کے لئے آمادہ ہوتے۔ ''عاشقان آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا'' ان کا محبوب مصرعہ تھا۔ وہ چاہتے تو کئی درجن کتابوں کے مصنف ہو سکتے تھے۔ اس کے برخلاف تھوڑا سا کام اقبال پر کیا۔ تھوڑے سے تراجم۔ ویسے ٹی ایس ایلیٹ کی نظم ''ویسٹ لینڈ'' پر انکا ترجمہ جسے ''شب خون'' نے بڑے اہتمام سے چھاپا ہے اس قدر وقیع اور معتبر ہے کہ اس کے مقابلے میں کئی تخلیقی اور تالیفی کام پھیکے پڑ جائیں۔

سراج صاحب کے بارے میں لکھتے ہوئے پروفیسر سید وحید الدین صاحب کا ذکر ضروری ہے۔ شعبہ فلسفے سے وابستہ عالم خوندمیری صاحب کے استاد بھی تھے۔ آخری زمانہ میں سعید آباد میں رہتے۔ عالم صاحب کی وفات کے بعد پہلا عالم خوندمیری لکچر انہوں نے ہی دیا تھا۔ اقبال پر

کتابیں بھی لکھی تھیں۔ بڑے قد آور اسکالر تھے۔ سراج صاحب سے دوستی نہ ہوتی تو میں ان کی ملاقاتوں سے محروم رہتا۔ بیماری کے آخری زمانہ میں سراج صاحب ہی ان کے مستقل ملنے والوں میں تھے۔ اکثر اپنے ساتھ بھی لے جاتے۔ پروفیسر صاحب جیسا زندہ دل اور بذلہ سنج شخص میں نے بہت ہی کم دیکھا ہے۔ ان کی رحلت سے ایک ہفتہ قبل سراج صاحب اور میں ان کی عیادت کو گئے۔ بڑی مشکل سے پلنگ پر اٹھ بیٹھے بیماری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہوں نے جو ایک شوخ جملہ کہا تھا اس کی کیفیت کو میں کبھی بھول نہ پاؤں گا۔ کہا تھا: ''بھئی جوانی میں ہم محبت کرتے تھے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیوں کرتے ہیں اور اب بڑھاپے میں محبت کرتے ہیں تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ہم دونوں اس قہقہے میں شامل ہو گئے۔ سراج صاحب کے احباب کی محرومی کہ ہم لوگوں کو یہ موقع ہی نہ ملا کہ بیماری میں ان کی عیادت کرتے۔ ان کی کچھ باتیں سننے کو ملتیں ایسے گئے کہ پھر ہوش نہیں آیا۔ ایک دن قبل اُن کے بیٹے جعفر امریکہ سے آئے تو چند لمحے انہیں دیکھا بات تک نہ کر سکے رحلت سے دو دن قبل انکی صاحبزادی شہلا آئیں تو انہیں دیکھ بھی نہ سکے۔ ۱۵ر جولائی ۲۰۰۶ء کی صبح یہ اطلاع ملی کہ انکی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ اسی دوپہر میں نے اپنے گھر کے صحن میں کوئل کی آواز سنی۔ اس موسم کی وہ آخری آواز تھی۔ اس کے بعد وہ آواز پھر سنائی نہیں دی۔ شاید یہ آواز اب اگلے سال ہی سن سکوں لیکن ماتم یہ کہ سراج صاحب کو اس میں شریک نہ پاؤں گا۔

☆☆☆☆

سلطان لطیف

استادمحترم
سید سراج الدین صاحب مرحوم

میرے محترم و شفیق استاد سید سراج الدین صاحب کے انتقال کی خبر سیاست کے ذریعہ ملی ۔ میرے لئے تو یہ ایک ذاتی صدمہ ہے ہی، لیکن ساتھ ہی حیدرآباد کے علمی اور ادبی حلقوں کے لئے ایک بڑا سانحہ اور نا قابل تلافی نقصان ہے۔خبر پڑھنے کے بعد کچھ دیر تک تو صدمہ کا اثر دل و دماغ پر طاری رہا۔ پھر آہستہ آہستہ سراج صاحب سے تعلق کی کتنی ہی یادیں ذہن میں تازہ ہوتی چلی گئیں۔

سراج صاحب سے میری شناسائی کا سلسلہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں سے شروع ہوا۔عثمانیہ یونیورسٹی سے میرا تعلق طالب علمی کا بھی تھا اور ملازمت کا بھی ۔ میں نے جب یونیورسٹی میں ملازمت شروع کی تو سراج صاحب کی شہرت شعبہ انگریزی کے ایک ممتاز ، مقبول اور لائق استاد کی حیثیت سے تھی کچھ عرصہ تک تو بات صرف غائبانہ تذکروں تک تھی ۔ پھر گاہے بگاہے مختصر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سراج صاحب کی شخصیت میں ایک خاص کشش تھی۔ بات کرنے کا منفرد انداز اور مخصوص لب ولہجہ تھا۔ ہر ملاقات کے بعد ان کی شخصیت کا تاثر ملنے والے پر اور گہرا ہو جاتا تھا۔ طبیعت میں بے حد سادگی تھی۔ گفتگو کے وقت ہمیشہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی تھی ۔ بات میں نہ تکلف نہ تصنع ۔ ناواقف آدمی کو ان کی قابلیت کا کوئی اندازہ نہ ہوسکتا تھا جب تک کہ وہ کسی موضوع پر بولنے نہ لگیں ۔ میرا ان سے خصوصی تعلق اس وقت شروع ہوا جب میں نے ایم اے انگریزی کی کلاس میں داخلہ لیا۔ اب تک کی سرسری شناسائی استاذ و شاگرد کے خصوصی تعلق میں بدل گئی ۔ اب سراج صاحب کو تقریباً روز ہی قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا۔ اب تک صرف ان کی لیاقت کا تذکرہ سنا تھا اب استفادہ کی راہ کھل گئی۔

سال اول وہ ہمارے بیاچ کو یونانی اور رومن کلاسیکل شاعری پڑھانے پر مامور تھے۔

جب ان کے لکچرز شروع ہوئے تو اندازہ ہوا کہ اس موضوع پر ان کی معلومات غیر معمولی وسیع اور مطالعہ بہت گہرا تھا۔ اصل میں پڑھانے سے پہلے وہ اس دور کے سماجی، سیاسی، اور ادبی حالات کی ایسی منظر کشی کرتے تھے کہ سننے والے گویا ذہنی طور پر اس دور میں اور اس مقام پہنچ جاتے تھے۔ شروع میں دو ایک لکچرز تو اس موضوع پر ہوتے تھے۔ پھر جو اصل متن پڑھانا شروع کرتے تو طلبا کو شاعری کا سمجھنا اور لطف اندوز ہونا آسان ہو جاتا۔ اصل متن کے علاوہ اس دور کے ادب اور آرٹ کے مختلف موضوعات پر بڑی دلچسپ، عالمانہ اور سیر حاصل گفتگو فرماتے۔ کلاس میں صرف انگریزی بولتے تھے۔ البتہ کلاس کے باہر نجی ملاقاتوں میں کھل کر اردو شاعری پر بھی گفتگو ہوتی۔ قدیم و جدید اردو شاعری و ادب پر انکی گہری نظر تھی دوران گفتگو متعدد اردو شعراء خاص طور پر غالب، اقبال اور فیض وغیرہ کے اشعار برمحل اور بے ساختہ Qoute کرتے جاتے تھے۔ تدریس کا طریق بھی بڑا دلچسپ تھا۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم نے نکتہ اٹھایا کہ یونانیوں میں حس مزاح نہ تھی۔ سراج صاحب نے اس وقت کوئی جواب دینے کے بجائے یہ فرمایا کہ کل اس موضوع پر مباحثہ ہوگا۔ دوسرے دن کلاس روم کے بجائے ان کے اسٹاف روم میں نشست ہوئی۔ میز کی ایک جانب وہ تھے اور دوسری جانب بالکل قریب ہم سات یا آٹھ طلباء تھے۔ ہنس کر فرمانے لگے ''It is as if I am facing an enquisition'' پھر بحث شروع ہوئی اور طلباء ہی سے مباحث کے ذریعہ انہوں نے اس کا جواب اخذ کروایا۔

سال دوم ان کے ذمہ ہمارے بیاج کے لئے رومینٹک دور کی شاعری کی تدریس تھی۔ جب ورڈ سورتھ، کیٹس، شیلی اور بائرن کو پڑھانے لگے تو اندازہ ہوا کہ اس دور کی شاعری اور ادب پر بھی وہ کس قدر حاوی تھے رومینٹک شاعری کو بھی انہوں نے غیر معمولی مہارت سے پڑھایا لکچر کے دوران طلباء کی پوری توجہ لکچر پر مرکوز ہوتی تھی۔ لکچر کے ختم پر سوالات و جوابات کا دلچسپ سلسلہ کچھ دیر تک جاری رہتا۔ طالب علموں کے ہر سوال کا جواب خندہ پیشانی سے دیتے۔ گفتگو میں بلا کی ذہانت اور بذلہ سنجی ہوتی تھی۔ دو سال کی اس طالب علمانہ صحبت کے بعد بھی سراج صاحب سے تعلق برقرار رہا۔ گاہے بگاہے کسی نہ کسی تقریب سے ملاقات ہو جایا کرتی۔ ادب اور شاعری کے علاوہ مذہبی اور دینی موضوعات پر جب گفتگو ہوتی تو معلوم ہوتا تھا کہ موصوف، مذہب، تصوف اور فلسفہ کے میدانوں کے بھی شہ سوار ہیں۔ خاص طور پر اقبال کی شاعری اور فلسفہ

پر گہری نظر تھی۔ کچھ یہ ذوق خاندانی بھی رہا ہوگا۔ سنا ہے عثمانیہ یونیورسٹی کے اولین دور کے شعبہ فلسفہ کے نامور پروفیسر صلاح الدین صاحب ان کے ماموں ہوتے تھے۔

سراج صاحب کی شخصیت کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ وہ اپنی لیاقت و قابلیت سے کوئی ذاتی فائدہ اٹھانے سے بہت دور تھے۔ نہ اپنی شہرت چاہتے تھے۔ نہ مالی منفعت۔ بلکہ بڑی حد تک اپنے آپ کو چھپائے رکھنے کا میلان تھا۔ اگر حیدرآباد کے ادبی اور علمی حلقوں نے انہیں بار بار عوامی اسٹیج پر آنے پر مجبور نہ کیا ہوتا تو جو شہرت ان کی ہوئی وہ بھی نہ ہوتی۔ جتنا کچھ کام انہوں نے کیا ہے اور جو کچھ علمی استفادہ ان سے اٹھایا گیا ان کی استعداد کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ وہ چاہتے تو اور بہت کچھ کام کر سکتے تھے لیکن ان کی طبیعت کا استغناء، شہرت اور خودنمائی سے گریز ان کے لئے سدراہ تھے۔ ان کی یاد ان کے چاہنے والوں اور قدردانوں کے دلوں میں عرصہ تک زندہ رہیگی۔ حیدرآباد کے علمی اور ادبی منظر سے کیسے کیسے قدآور لوگ رخصت ہوگئے۔ بقول شاذ مرحوم۔

کیا زمانے گئے کیا لوگ زمانے سے گئے۔

○○○○○

شاہ بلیغ الدین

سید سراج الدین

(یہ سوانحی نوٹ سراج صاحب کی حیات میں لکھا گیا)

پروفیسر صلاح الدین اور جلال الدین اشک .....دونوں سراج کے ماموں تھے۔ دونوں جامعہ کی تاریخ کے معتبر نام ہیں۔ سراج میرے ہم جماعت بھی ہیں اور فرزندانِ جامعہ میں ایک خاص مقام بھی رکھتے ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی آپ بیتی .....خواب باقی ہیں! میں لکھا ہے کہ وہ کشمیر کی جامعہ میں اقبالیات کے پروفیسر مقرر ہوئے تو ان کے ذہن میں توسیعی تقریروں کے لئے دو نام آئے .....ا۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری، ۲۔ پروفیسر سراج الدین! دونوں جامعہ کے نامور فرزندوں میں سے ہیں۔ سراج صرف ادبیات انگریزی پر نہیں اردو، فارسی پر بھی اچھی نظر رکھتے ہیں۔ فرانسیسی، جرمن اور اطالوی سے بھی بصد ذوق واقف ہیں۔ نقاد کی حیثیت سے بھی معتبر مقام کے حامل ہیں۔ ان کا تازہ ترین خط حسب ذیل ہے:.....

بلیغ بھائی سلام علیکم!

کرم نامے کا شکریہ۔ اب پتہ چل رہا ہے کہ مادر جامعہ سے کیا محبت ہے ہم لوگوں میں، کیا وطن کی لاگ (Nostalgia) ہوتی ہے۔ اس سے پہلے میں نے انوار العلوم کے ذریعہ جن لوگوں کے بارے میں سوال نامے ارسال کئے وہ حسب ذیل ہیں۔ پروفیسر صلاح الدین، جلال الدین اشک، پروفیسر نعیم الدین (انگریزی) اب یاد نہیں شاید کچھ اور بھی ہوں، ہاں ایک نام یاد آیا، پروفیسر تقی علی مرزا (انگریزی) آپ نے جو تفصیل مانگی ہے وہ درج ذیل ہے:.....

ا۔ والد سید معین الدین مرحوم ولد عبدالرحمٰن، والدہ شرف النساء بیگم بنت محمد وحید الدین (وحید جنگ)۔ والد نے سٹی کالج سے ملازمت کا آغاز کیا۔ سائنس کے استاد رہے، پھر مددگار ناظم تعلیمات اور آخر میں پرنسپل گلبرگہ کالج بنے۔ جہاں سے وہ پولیس ایکشن سے کچھ پہلے مارچ یا اپریل ۴۸ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۹ر نومبر ۵۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اپنے کردار، انتظامی صلاحیت

طبع سلیم اور پختہ فہم کی بنا پر ممتاز حیثیت کے حامل رہے۔ ان کے کردار کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ خصوصاً ان کے صبر و ضبط اور فراخ دلی کا! (مجھے یہ کردار اور منصب نصیب نہیں) بھائی بہنوں میں میرا نمبر دوسرا ہے۔ ویسے پہلا سمجھئے کیونکہ مجھ سے پہلے بھائی کا طفلی میں انتقال ہو گیا تھا۔ ہم لوگ چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ بعد کے دو بھائیوں کا طفلی میں اور ایک بہن کا جوانی کے آغاز میں انتقال ہو گیا۔ میں اس وقت سب سے بڑا ہوں۔ میری تعلیم کی تفصیل حسب ذیل ہے:.....

۲۔ میٹرک ۱۹۴۰ء (نا مپلی ہائی اسکول) ایف اے۔ ۱۹۴۲ء۔ آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ۔ بی اے ۴۴ء میں تاریخ ہند، (عہد وسطیٰ) سیاسیات، عمرانیات! ایم اے ۱۹۴۶ء انگریزی۔ ڈپلوما ان جرمن ۴۲ء، ڈپلوما ان فرنچ ۶۳ء جامعہ عثمانیہ ۱۹۵۶ء میں حکومت ہند کے وظیفے پر اٹلی میں ایک سال رہ کر اطالوی سیکھی۔ اٹلی میں ایک مقام پروجائیہ (perugia) ہے، امبریا (Umbria) کا صدر مقام ہے۔ وہاں کی (University of Freiguns) کا طالب علم رہا۔ اطالوی کی جو سند مجھے ملی وہ مجھے اٹلی سے باہر اطالوی پڑھانے کا اختیار دیتی ہے۔

۳۔ خاموش طالب علم رہا ہوں۔ ویسے اسکول میں بہت انوکھی شرارتیں کر چکا ہوں۔ باقی کوئی خاص بات نہیں۔ ہاں انٹر میں تاریخ میں یونیورسٹی میں اول آنے پر مبلغ ۱۸/روپے وظیفہ سال بھر ملتا رہا۔ بڑا مزہ رہا۔ کھیلوں میں بہت حصہ لیا۔ ہر کھیل کھیلا سوائے پولو کے!

۴۔ شادی میں نے دیر سے کی۔ میری شادی ستمبر ۵۶ء میں اپنی سگی خالہ زاد بہن سے ہوئی جس کا نام قانتہ ہے۔ (سراج کے دو بچے ہیں۔ لڑکا انجینئر ہے اور امریکہ میں ہے۔ لڑکی انگریزی ادب میں ام اے ہے اور کینیڈا میں ہے (مصنف) قانتہ کے والد مرحوم محمد مرغوب الدین گلبرگہ کالج سے پولیس ایکشن کے کچھ سال بعد ریٹائر ہوئے۔ تعلیم کے بارے انہوں نے بڑا تفکر کیا تھا اور بڑے اور ریجنل خیالات رکھتے تھے۔ بچوں کے لئے ایک پرچہ نونہال جاری کیا تھا، (اچھا پرچہ تھا۔ سرورق ہمیشہ سفید چکنے کاغذ کا ہوتا تھا غنچہ، پھول اور پیام تعلیم کے ساتھ یہ رسالہ بھی ہمارے گھر آتا تھا)۔ (مصنف) کئی دلچسپ چارٹ بنوائے تھے۔ قانتہ کی والدہ میری والدہ کی سگی بہن ہیں (دونوں بقید حیات ہیں) ان کا نام رحیم النساء ہے۔

۵۔ والد کی طرح میں نے سٹی کالج سے اپنی ملازمت شروع کی۔ کچھ مہینے جونیئر لکچرر رہا، پھر

لکچرر ۳۰۰ء تا ۸۰۰ گریڈ کا غالباً اپ کو یاد ہوگا کہ ہندوستان میں کہیں اور ایسا فیاضانہ گریڈ نہیں تھا۔ ۱۹۵۹ء میں ریڈر اور جولائی ۸۳ء میں پروفیسر بنا، ہاشم علی صاحب کی وائس چانسلری کے دور میں! ہاشم اب بھی بار بار کہتے ہیں کہ تمہارا انٹرویو سب سے اچھا تھا۔ دل خوش ہوتا ہے ویسے ہاشم نہیں آتے تو پتہ نہیں پروفیسری ملتی بھی یا نہیں!

۸۵ء میں ریٹائر ہوا اور ایک سمسٹر (جولائی تا اکتوبر) کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں وزیٹنگ پروفیسر رہا۔ اقبال پر سات آٹھ لکچر دیئے۔ جنکو محترم سرور صاحب اسی وقت چھاپنا چاہتے تھے۔ میری بدقسمتی کہ انہیں نظر ثانی کے لئے لے آیا۔ وہ آج تک رکھے ہیں..... کاہلی!

۶۔ علمی وادبی کاموں کی تفصیل سناوں؟ کون سا تیر امارا ہے۔ لوسنو! دو آرٹیکل عثمانیہ کے شعبہ انگریزی کے علمی رسالے عثمانیہ جنرل آف انگلش اسٹیڈیز میں، دو اردو انسائکلو پیڈیا کے لئے ایک اطالوی اور ایک یونانی پر لکھے۔ ان کے علاوہ متفرق ترجمے اردو سے انگریزی، انگریزی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں کئے۔ ٹی ایس ایلیٹ کی مشہور نظم The Wasteland کا اردو ترجمہ آزاد بحر میں کر چکا ہوں۔ ویسٹ لینڈ طویل نظم ہے۔ جاوید نامہ کا بھی آزاد نظم میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ دعا کیجئے کہ پورا ہو۔ اقبال اکیڈمی (جس کا میں آج کل صدر ہوں) کے ادبی رسالے اقبال ریویو میں میرے کوئی دس بارہ مضامین چھپ چکے ہیں۔ انہیں جمع کر کے سری نگر کے لکچروں کے ساتھ کتابی شکل میں چھاپنا چاہتا ہوں۔ بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں جو پورے ہو سکتے تھے اور نہیں ہوئے بہر حال ..... تجاہل تغافل، تساہل کیا۔ (اب یہ کتاب مطالعہ اقبال کے نام سے چھپ گئی ہے مصنف)

ہاں آج کل علاوہ اقبال اکیڈمی کے صدر ہونے کے میں مشہور جرنل اسلامک کلچر (انگریزی) کا ایڈیٹر بھی ہوں، اسلامک کلچر والا کام شاید جلد چھوڑوں۔

امید ہے کہ مع خاندان بخیر و عافیت ہوں گے اللہ حافظ۔

اک وقت خاص، حق میں میرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میر صاحب قبلہ فقیر ہو

ناچیز سراج الدین

سراج نے حیدرآباد کے ایک علمی اور ادبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ انکے نانا محمد وحید الدین بعد میں نواب وحید جنگ ۱۸۸۴ء میں حیدرآباد سیول سروس کے پہلے امتحان میں کامیاب ہوئے۔

وحید جنگ کے والد مولوی فریدالدین ناظم فوجداری تھے اور فقہ کے بڑے عالم تھے۔ پروفیسر صلاح الدین وحید جنگ کے صاحبزادے تھے جو حیدرآباد کے ممتاز دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں۔سراج کی ذہنی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

سراج بلحاظ منصب استاد ہیں اور بلحاظ طبیعت بڑے درویش صفت آدمی ہیں۔ لکھتے ہیں تو ڈالے رکھتے ہیں۔شعر کہتے ہیں تو سناتے نہیں۔ اقبال پر ان کے مضامین چھپ جائیں تو اقبالیات میں اچھا اضافہ ہیں ان کی افتادطبع کو سمجھنے کے لئے انہی کے دو شعر سن لیجئے۔

اک تکلف تھا کہ دامن گیر ہر لحظہ رہا
مئے کشوں کی بھیڑ سے کترا کے میخانے گئے

سن اے گمنامی نہ پھیلی شہر میں شہرت تو کیا
دوستوں کی ہر نجی محفل میں تو مانے گئے

اقبال پر جو لکچر انہوں نے کشمیر یونیورسٹی میں دئے تھے وہ پروفیسر آل احمد سرور چھاپنا چاہتے تھے۔انہوں نے جواب دیا..... ذرا نظر ثانی کی اجازت دیجئے! اس نظر ثانی کو برسوں گزر گئے۔ امریکہ میں مجھ سے بات ہوئی تو مجھ سے وعدہ کیا کہ..... حیدرآباد لوٹ کر پہلا کام نظر ثانی کا ہوگا۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ کتاب تیار ہے پھر اطلاع ملی چھپ رہی ہے ساتھ ہی یہ مژدہ بھی ملا کہ ایک عدد نسخہ میرے لئے بھی آرہا ہے۔ کتاب آئی تو میں نے پڑھ کر خط لکھا کہ..... برادرم! دل خوش ہوگیا۔ یہ کتاب اقبالیات میں بلاشبہ ایک اچھا اضافہ ہے۔ اتنے ادبی زاویوں اور حوالوں سے کسی نے بھی اقبال کے کلام اور افکار کا تجزیہ نہیں کیا۔ جادۂ خویش کی یہ روش پسند آئی۔ پورا شعر یوں ہے۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش!
کہ راہ دیگراں رفتن عذاب است

ولادت ۳۰/جون ۲۴ء

ماخوذ از تذکرہ عثمانین۔ ناشر اردو اکاڈیمی سندھ مطبوعہ اگست ۲۰۰۱ء

○○○○

شاعر: پروفیسر شیو کے کمار
مترجم: سید علی ظہیر

سراج کی یاد میں

ایسا لگتا ہے کہ آپریشن ٹیبل پر پڑے مریض کی آنت سے
انسانی اعضاء کا سپورٹ سیسٹم جڑ گیا ہے
اس کیبن سے کہ جہاں سے آج تک کوئی زندہ نہ جا سکا
جہاں ہوا بھی تاروں میں الجھ کر رہ جاتی ہے
وہاں وہ پڑا گہری نیند سو رہا ہے
اس کا سر خالی دیوار کی طرف ڈھلک گیا ہے
اسے اب اطراف و جوانب کی کوئی فکر نہیں رہی
وہ پورے اسی سال کے سخت کوہستانی سفر کے بعد سویا ہے

چلنے سے پہلے
میں کسی کے قدموں کو چھو تو لوں
جو جسم سے زیادہ فکر اور مادہ سے زیادہ روح بن چکا ہے

اس تاریک کمرے کا فاصلہ یہاں سے صرف چند قدم ہی ہے
جہاں وہ دوسرے جسموں کے ساتھ گڈمڈ ہو گیا ہے
گنہگار یا نیک، مجرم یا منصف
وہ بے نام ہو گیا ہے
اس کا نیا نام پیشنٹ نمبر ۶۰۸ ہے

'بل ادا کردو' ایک کھنکتی ہوئی آواز کاونٹر سے ابھری
'اس سے پہلے کہ ہم تمہیں میت لے جانے کی اجازت دیں'

کہیں دور ہری گھاس والی زمین کا ایک چپہ منتظر ہے
جس کے نیچے وہ صور پھونکے جانے تک سوتا رہے گا
کچھ فرشتے جنت کے دروازے پر اس کے منتظر ہیں
اب اس کے پاس، جاوید نامہ' اور 'ویسٹ لینڈ' سے ماوراء جانے کا
ڈھیر سارا وقت ہوگا
اس نے کبھی آسانی سے حاصل ہونے والی چیز نہیں لی
اس نے ہمیشہ اپنی نظریں سات آسمانوں سے پرے چمکتے ہوئے ستارے پر رکھیں

'خدا حافظ سراج' تمہارے جانے سے یہ زمین یتیم ہوگئی ہے'

○○○○

سید امتیاز الدین

ایک نظم

(پروفیسر سید سراج الدین صاحب کی یاد میں)

نہیں اس گلشن ہستی میں
ہم سا بے خبر کوئی
نہ جانے ہم یہاں کیوں آئے ہیں
کب سے کھڑے ہیں
منتظر کس کے

○

ان ہی بے نام رستوں سے
نہ جانے قافلے کتنے
یوں ہی ہر دن گزرتے ہیں

وہ چہرے
پر کشش چہرے
وہ باتیں
دل نشیں باتیں
ملاقاتیں
وہ لمحے
جن سے ماہ و سال کی تشکیل ہوتی ہے

نہ جانے قافلے کتنے

ان ہی بے نام رستوں سے

ہمارے دل کی وادی سے

جو گزرے

اس طرح گزرے

وہ چہرے پھر نہیں لوٹے

○

سفر کوئی بھی ہو

خوش بو کا

ماہ و سال کا

یا رنج و راحت کا

سفر کوئی بھی ہو ہم کو سفر اچھا نہیں لگتا

نہیں اس گلشن ہستی میں

ہم سا بے خبر کوئی

ہمیں اس کی خبر کب ہے

کہ ان بے نام رستوں سے

ہمیں کس دن گزرنا ہے

سفر ہم کو بھی کرنا ہے!

○○○○

پروفیسر سید سراج الدین

اقبال اور عصری تقاضے

(یہ مضمون ۱۹۷۷ء میں منعقدہ ایک سمینار میں پڑھا گیا تھا۔ جو پروفیسر سراج کی اقبالیات پر غالباً اولین تحریر ہے)

جس غائر اور تجزیاتی مطالعے کی اس طرح کی علمی بحث کے لئے ضرورت ہے۔ اس کا مجھے موقع نہیں ملا۔ البتہ اپنی نسل کے ہزاروں اردو دانوں کی طرح میں نے بھی اپنی زندگی اقبال کی شاعری کے ساتھ گزاری ہے۔ اس وقت اس کے شعر سنے جب تحریر پڑھنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی۔ بہت ہی بچپن میں میں جن شاعروں سے آشنا ہوا وہ اقبال اور اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔ شائد اسی توسل کے سبب مجھے کبھی ایسا شعر پسند نہیں آیا۔ جس میں خلوص اور مذاق کی طہارت نہ ہو۔ اس نجی داستان کو چھیڑنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اس صدی کے تیسرے دہے میں ہوش سنبھالنے والے مجھ جیسے بے شمار لوگوں کے لئے اقبال ایک ایسا شاعر ہے جس کی شخصیت دل و دماغ پر مرتسم ہو چکی ہے۔ جس کی شاعری کا زیر و بم ہمارے خون کی گردش میں سما گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کی بحث کی ابتدا کی ذمہ داری یہ سوچ کر قبول کر لی ہے کہ میری باتوں کا علمی وزن چاہے کچھ ہی ہو ان میں جذب و خلوص تو بہر حال شامل رہے گا۔

اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ایک ابتدائی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حالیہ برسوں میں انکی مقبولیت میں جو کمی ہوئی ہے اس کا کیا سبب ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جس شخص نے کم و بیش پچاس سال اس دیس میں بادشاہی کی آج غریب الدیار معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کی تشکیل کے بعد سے اقبال کی شاعری ایک کساد بازاری کی زد میں رہی ہے۔ شاعروں کی ادبی یا کوئی مقبولیت کا مدد جزر کوئی نئی بات نہیں اور اس ضمن میں زیادہ فکر مند ہونے کی بھی ضرورت نہیں لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ اقبال کی پیدائش کے اس سو (۱۰۰) سال میں اس کی شاعری کا پھر سے تجزیہ کریں اور اقبال کی جاودانیت کو اب نئے رنگ سے ابھاریں۔

میرے خیال میں اقبال کی مقبولیت میں کمی اس وجہ سے آئی کہ ان کی شاعری غلط فہمی اور نافہمی دونوں کا بہ یک وقت شکار ہوئی ۔نافہمیوں میں اقبال کے بہت سے پر جوش پرستار شامل ہیں۔ جنہوں نے ان کے اشعار کو سیاسی مجلسوں میں گھسیٹ کر اور انہیں مختلف اغراض کے لئے استعمال کر کے اقبال کی بڑی بد خدمتی کی نیک نیتی سے کی ہوگی لیکن کی ضرور۔ غلط فہمیوں میں وہ لوگ شامل ہیں جن کو اقبال کی شاعری کا اسلامی رنگ بے مزہ کر دیتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ بس پیلا ہی رنگ عاشقی کی نشانی ہے اور اس کم نظری کے باعث ایک بڑے عاشق بیدار کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اقبال کی شخصیت کی تشکیل جدید میں ان دونوں گروہوں سے نمٹنا از بس ضروری ہے۔لیکن چونکہ یہ بجائے خود ایک مستقل بحث ہے میں اسے فی الحال ایک اشارے تک ہی محدود رکھوں گا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ مسئلہ بے حد اہم ہے اور میں نے ایک چھوٹے سے انگریزی مضمون میں اس کے خدوخال پیش کئے ہیں جو میں نے اس غرض سے لکھا تھا کہ موقعہ ہے تو کسی کھلے اجلاس میں گوش گذار کر دوں لیکن رنگ محفل نے اس کی اجازت نہیں دی۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔۔۔آج کی بحث کی طرف لوٹیے تو دو بنیادی سوال ذہن میں ابھرتے ہیں۔اور میں بہ نظر اختصار انہیں دو سوالوں پر آج گفتگو کروں گا کیوں کہ اقبال کے مقام کا تعین انہیں کے تحت ہو سکتا ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا اقبال نے کوئی ایسی قدریں دی ہیں۔ جو نہ صرف عصرِ حاضر بلکہ آیندہ زمانوں کے لئے بھی اہمیت رکھتی ہیں؟ دوسرا یہ کہ کیا ان قدروں کی پیش کش محض تفکرانہ ہے یا شاعرانہ بھی؟ کیا اقبال اپنی فکر کو شعر میں سمونے میں کامیاب ہوئے ہیں؟ جس سے میرا مطلب صوت و معنی، تفکر و ترنم کا وہ امتزاج ہے جو ہر اعلیٰ شاعر کی صفت اولیٰ ہے اور شاعر کی زندہ جاویدی کی ضامن اس ضمن میں، میں صرف اقبال کی شاعری کے بالغ اور اہم ترین حصے سے بحث کروں گا۔ تفصیلات کی نہیں۔ان کے دو مجموعے میرے زیر نظر ہیں۔

بال جبریل ''اور جاوید نامہ''۔یہاں پھر ایک جملہ معترضہ ضرور ہو جاتا ہے۔وہ یہ کہ اقبال کی مکمل Assesment وتحسین کے لئے بانگ درا از بس ضروری ہے۔اقبال کی حساس اور شاداب شگفتہ دلی جتنی اس کتاب میں ہے اور کہیں نہیں۔ بعد میں ان کی شاعری میں ایک ایسا حسن معرا پیدا ہوتا ہے جو بلندیوں سے مخصوص ہے اور جہاں فکر و نظر کی تطہیر کسی پیرہن کی

گنجائش نہیں چھوڑتی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ آخر کار ہر عاشقی کی معراج یہی بے لباسی ہے۔

اقبال کے اہم ترین تصورات میں سے جو میرے خیال میں آفاقی قدروں کی حیثیت رکھتے ہیں میں نے یہ چار چنے ہیں۔ عشق، فقر، آدمیت اور مرد مومن کا کردار۔ یہ ایسی قدریں ہیں جو موجودہ دور ہی کیا کسی زمانے میں بھی غیر متعلق یا پارینہ نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ عصر رواں میں جہاں داخلیت کے عذر نے فرد کو مریضانہ خود نگری میں مبتلا کر دیا ہے۔ اقبال کی یہ قدریں داروئے حیات کا رتبہ رکھتی ہیں۔

عشق تو ہماری شاعری کا مستقل سرمایہ ہے۔ مومنؔ و داغؔ کے ہلکے پھلکے عشق سے لیکر میر دردؔ کے صوفیانہ اور غالب کے فلسفیانہ عشق تک کتنی ہی منزلیں ہیں جو اردو شاعروں نے طے کی ہیں لیکن اقبال عشق کو ایک نئی جہت ایک نئی قوت عطا کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں پہلی مرتبہ عشق ایک قوت تخریب یا حالت استغراق نہیں بلکہ ایک قوت تکوین ایک تحریک مسلسل کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔

''سوز و تب و تاب اول؛ سوز و تب و تاب آخر''

یہ عشق زندگی کی سب سے بڑی قوت، سب سے بڑا خیر ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جو انسانوں کو حرارت بھی بخشتی اور ان کے قلب و نظر کی تہذیب بھی کرتی ہے۔ یہ عشق رہبانیت و ترک کی طرف نہیں پیکار و طلب کی طرف لے جاتا ہے جو انسانوں کو سرشاری و ترقی کے ساتھ ساتھ ایک نیا دبدبہ اور خودداری بخشتا ہے۔ جو انہیں گراتا نہیں اٹھاتا ہے۔''

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی　　کھلتے ہی غلاموں پر اسرار شہنشاہی

مسجد قرطبہ میں اس کی بڑی حرارت بخش تصویر ملتی ہے۔ عشق کی حریف عقل ہے اقبال عقل و عشق کو کائنات کی دو تکوینی قوتوں کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ یہ عقل و عشق کا معرکہ بھی اردو شاعری میں پرانا ہے لیکن اقبال کی شاعری میں یہ معرکہ جذباتی نہیں طبیعیاتی ہے اور انسانیت کی اعلیٰ ترین تہذیب دو قوتوں کے تصادم میں نہیں ان کے حریفانہ اتصال میں مضمر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر بے راہ رو ہو سکتے ہیں۔ مغرب میں اقبال کو عقل کی بے راہ روی نظر آتی ہے اور مشرق میں عشق کی بے راہ روی اور وہ ایک ایسے نظام کی تلاش میں ہیں جہاں ان دونوں میں توازن ہو۔ اس نقطے تک اقبال اسلام کے راستے سے پہنچتے ہیں۔ اقبال ایک صاحب علم شاعر

ہیں۔اوران کا فکری ارتقاء مغرب کے فلسفوں اور قدیم ہند کے مفکروں سے ہوکر گزرتا ہے۔ یہ ایک بہت طویل اور دقیق بحث ہے۔ یہاں میں صرف یہ کہنے کی ہمت کروں گا کہ اقبال کو یہ محسوس ہوا کہ مغرب کی فکر ایک حد تک آکر ٹھٹک جاتی ہے اسے حضوری نصیب نہیں۔ عارفان ہندی کی فکر اپنے تجسس اور گہرائی میں بے پناہ ہے لیکن وہ ایسے مقام پر پہنچتی ہے جہاں عمل کی نفی ہوتی ہے جو زندگی کی نفی ہے۔ دیارِ ہند اور دیارِ مغرب کے درمیان اقبال کو اسلام ہی ایسا نظام معلوم ہوا جس میں فکر وعمل جذب وجہد کی یکجائی ہے۔ اقبال کا یہ اسلام عجم کا متصوفانہ اسلام نہیں جو بے عمل ہے بلکہ قرآن کا وہ مجاہدانہ اسلام ہے جس کی اساس ''جذب مسلمانی'' پر ہے۔

اے رہروِ فرزانہ بے جذبِ مسلمانی نے راہِ عمل پیدا نے شاخِ یقین نمناک

اس ذوق عمل اور جذب مسلمانی کی اقبال نے ہر انسان میں قدر کی ہے چاہے رسمی طور پر مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

اقبال کا یہ اسلام ایک آفاقی بلکہ کائناتی تحریک ہے جس سے انسانیت اور اُس کی تہذیب کی قسمت وابستہ ہے۔ اس کو فرقہ پرستی کے زمرے میں گھسیٹنا نہ صرف کور نظری بلکہ بد ذوقی کی علامت ہے۔ یہ وہ اسلام ہے جس کو سمجھنے کے لئے مسلمان ہونے کی شرط نہیں صرف صاحب نظر ہونے کی شرط ہے۔

اس تخلیقی عشق سے وابستہ اقبال کا تصور فقر ہے۔ اس فقر کی بے باکی اور بانکپن اردو بلکہ عالمی ادب کی نہایت ہی جمیل قدریں ہیں۔ درویشی ذہنی آزادی اور بے نیازی کا نام ہے۔

ایک ایسے زمانے میں جب کہ بڑے بڑے صاحب علم وذکاوت اپنی ذہنی دیانت داری کا سودا کرنے تیار ہیں اقبال کا یہ قلندر ایک ایسی علامت ہے جس کو تابندہ رکھنا انسان کی خودداری اور انا کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے یہ ایسا شخص ہے جس نے بندشوں سے آزادی حاصل کر لی ہے اور جس کا دل بے خوف ہے۔

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
ہزار خوف ہو لیکن زبان ہو دل کی رفیق یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

اس فقر اور اس کی بے نیازی کے آگے شان خسروی بھی بے حقیقت ہے۔ اس میں سربلندی بھی ہے۔ اور خاکساری بھی۔ عجز بھی اور کبریائی بھی۔ (بال جبریل ص ۲۱۳) (بال

بریل ص ۱۱۰)

اقبال کے درویش کے دوش بہ دوش اس کا مرد مومن ہے۔ بلکہ قلندر اور مرد مومن ایک ہی انسان کے دو نام ہیں۔ قلندر کی اصطلاح عجمی ہے۔ مرد مومن کی عربی۔ درویش کی طرح یہ مرد مومن دو ایسی صفات کا مجموعہ ہے جو بظاہر متضاد ہیں۔ لیکن جن کی یکجائی حیات کی قوت اور زندگی کی بہترین قدروں کی نمود کی ضامن ہے۔ جس طرح قلندر میں خاکساری و سروری بے سامانی و فقر و رت یکجا ہیں۔ مرد مومن میں حلاوت و جبروت، قہاری، جباری، صلح و پیکار کا امتزاج جلوہ گر ہے۔ یہ بھی مرد آزاد ہے۔

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

یہ ایسا شخص ہے جس کو حیات گیر قوت کے احساس نے نرم و شیریں سخن بنا دیا ہے اور جس کے دل میں انسانیت کا درد اور ایک ایسی تڑپ ہے جو فرشتوں کو نہیں صرف انسانوں کو نصیب ہو سکتی ہے۔ ''نظر بلند۔ نگہ دل نواز، جان پرسوز۔ یہ ایسا انسان ہے جس کو رومی کے ایک قطعہ میں ایک شخص چراغ لے کر ڈھونڈتا ہے۔ کہ ''از دام و دد ملولم و انسانم آرزوست'' میں درندوں اور مویشیوں سے بے زار ہوں۔ اور مجھے انسان کی تلاش ہے کیا آپ نہیں سمجھتے کہ رومی کے شیخ با چراغ کو جس انسان کی تلاش تھی آج بھی مشرق و مغرب دونوں کو ہے؟ کیونکہ درندگی و گوسفندی کی آج بھی کوئی کمی نہیں۔ اقبال کا مرد مومن ایک آفاقی انسان اور ایک کائناتی قدر ہے۔ انسانی تاریخ اس میں اپنے عروج کو چھوتی ہے۔ جس طرح جاوید نامے کا عارف ہندی عریاں بدن و صوئے بر سر بستہ، دنیا کی بندشوں اور وقت کی گردش سے بلند ہند و فکر و دھرم کا اعلیٰ ترین اظہار ہے۔ اُسی طرح مرد مومن اسلام کی روحانی قدروں کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ دونوں کائناتی ہیں۔ دونوں دیر و حرم، کی پیداوار اور دونوں دیر و حرم سے آزاد۔ (بال جبریل ص ۱۳۲)

اقبال کی ہاں انسان اور آدمیت کا درجہ بہت اونچا ہے۔ کائنات میں انسان کو وہ مقام حاصل ہے جو کسی اور شے کو نہیں۔ اس مضمون پر اقبال کے بے شمار شعر ہیں اور میں تفصیل میں گئے بغیر صرف اس فرق کی طرف اشارہ کروں گا، جو مغرب کے Humanism اور اقبال کی آدمیت میں نمایاں ہے۔ مغرب کی ہیومانزم، فرد کے احترام اور آزادی کی فضا میں اس کی مکمل نشو و نما پر مبنی ہے۔ اس کا اثر مغرب کی تہذیب و روایات اور اداروں پر بہت گہرا ہے اور خود

ہندوستان میں جواہر لال نہرو اس کی ایک اعلیٰ مثال ہیں۔ جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ

آدمیت احترام آدم است

تو وہ کم وبیش اسی Humanism کے قریب ہیں لیکن وہ انسان کی ارضی اہمیت پر نہیں رکھتے اور یہ کہہ جاتے ہیں کہ ''برتر از گردوں مقام آدم است'' مغرب Humanism انسان کو اس کے ارضی ماحول ہی میں رکھ کر اس کی تہذیب چاہتا ہے۔ اقبال کی آدمیت آسمان سے بھی اسی طرح منسلک ہے۔ جس طرح زمین سے پیوست۔ یہ گویا مغرب کے Humanism میں ایک جہت کا اضافہ جس کی وجہ سے وہ جذب ممکن ہو جاتا ہے جس کو اقبال حرکت ونشاط دونوں کا ماخذ سمجھتے ہیں اور جس کے عدم وجود نے مغرب کو اس سرشاری اور سرمستی سے محروم کر دیا۔ جو انسان کا سب سے بڑا قیمتی سرمایہ ہے (جاوید نامہ ص ۹۔)

اس بحث میں میں نے آپ کا اتنا وقت لے لیا کہ جو دوسرا سوال میں نے اٹھایا ہے اس پر گفتگو کو مختصر کرنا پڑے گا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اقبال کے تفکر نے اکثر اس کے حسن کو متاثر کیا ہے۔ بانگ درا اور پیام مشرق کا حساس شیریں گفتار اور شگفتہ دل شاعر اپنی فکر کی رفتوں پر پہنچ کر اپنی شاعری کے ملبوس کو مسل دیتا ہے۔ لیکن جس مقام پر اقبال نے وہ نقطہ اتصال ڈھونڈ لیا ہے جہاں اس کی فکر اور اس کا جذب ہمکنار ہو گئے ہیں وہاں اقبال نے اعلیٰ ترین ادب پیدا کیا ہے۔ اقبال اپنے سارے تفکر اور تجرد علمی کے باوجود ایک صاحب دل صاحب حال قلندر بھی ہے اور جب اس پر جذب کی کیفیت طاری ہوتی ہے ''اٹھتے ہیں حجاب آخر، کرتے ہیں خطاب آخر'' تو وہ مجذوب کی بکواس نہیں کرتا بلکہ لافانی شعر پیدا کرتا ہے کیونکہ حالت جذب میں بھی اس کا ذہن بیدار اور آنکھ روشن رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اقبال کو خلوص سے اور بیدار مغزی کے ساتھ پڑھا جائے تو وہ لوگ بھی جو اس کی مسلمانی سے ذرا کھٹکتے ہیں اس کی قلندری کی زد سے نہیں بچ سکتے۔

اقبال نے شعر کو ایک ایسا لب ولہجہ عطا کیا جو اردو اور فارسی شاعری میں کہیں اور نہیں ملتا معلوم ومعروف بحروں میں جب اقبال شعر کہتا ہے تو یہ احساس ہوتا ہے یہ کوئی نئی بحر ہے۔ اقبال کی شاعری میں ایک ایسا تموج ہے جو اس کو پڑھتے پڑھتے خون کی گردش میں در آتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ ایک ایسی قوت کے نرغے میں ہیں جس سے نہ آپ نکل سکتے ہیں نہ نکلنا

یا ہتے ہیں اس کی شاعری قوت ونشاط کا ایک ایسا مربوط تاثر پیدا کرتی ہے جو مجھے کسی اور شاعر
ں نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے اقبال بے حد منفرد ہے۔ نہ اس سے پہلے اس کا انداز کہیں ہے نہ اس
کے بعد۔ اس میں شک نہیں کہ فکر ونشاط کا یہ کامل امتزاج جہاں لفظ ومعنی مدغم ہو جاتے ہیں اقبال
ی کم نظموں میں ملتا ہے لیکن پھر بھی اتنی کثرت سے ضرور ملتا ہے کہ اقبال کو اس کی بناء پر آفاقی
شاعروں میں شمار کیا جائے۔ جاوید نامہ اور بالِ جبرئیل اس شاعرانہ کمال کے سب سے زیادہ
امل ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس لحاظ سے ''مسجد قرطبہ'' اقبال کی شاعری کا نقطہ عروج اور
ں کے شعور کا مرکزی نقطہ ہے۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر سید سراج الدین

پروفیسر صلاح الدین۔ایک تاثر

۱۔کسی شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا دوصورتوں میں آسان ہے۔ایک صورت یہ ہے کہ مذکورہ فرد کا کوئی اہم کام ہو۔کچھ کھلے قابل ذکر کارنامے ہوں کہ انھوں نے فلاں کتابیں لکھیں، فلاں فلاں خدمات پر مامور رہے۔جسب ذیل اداروں کی صدارت یا معتمدی پر فائز رہے، فلاں تحریک چلائی، فلاں کالج قائم کیا یا مجلس کی بنیاد ڈالی۔ایسے لوگ بہت قابل قدر ہوتے ہیں کیوں کہ وہ انسانی زندگی یا ذہنی یا سماجی اسلوب میں ایک اضافہ کر جاتے ہیں۔یہ ایسے لوگ ہیں جو جذبہ خدمت کے علاوہ آپ ایسی انا رکھتے ہیں جو نمود اور منظر عام پر جلوہ گری کی متقاضی ہوتی ہے۔دوسری صورت یہ ہے کہ شخص موصوف میں کچھ ایسی صفتیں ہوں جنہیں میں صفات متداول کہوں گا جیسے یہ کہ یہ بڑے فیاض ہیں۔یا رحم دل ہیں یا محنتی ہیں یا ہمدرد ہیں خوش اخلاق ہیں 'خوش اطوار ہیں وغیرہ وغیرہ۔

۲۔لیکن اگر آپ کسی ایسے شخص کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں جس نے ایک جامع داخلیت کو اپنایا ایسے کاموں سے اجتناب کیا جو منظر عام پر آسکیں 'اپنی ذات کے حصار اتنے اونچے کر لیئے کہ عام نظر میں صرف در و دیوار کے نقش دیکھ سکیں تو صورت حال بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔

۳۔صلاح الدین صاحب کے ساتھ کچھ یہی معاملہ درپیش ہے۔جن لوگوں نے انھیں دیکھا وہ زیادہ تر اس طرح کہ جیسا غالباً حسرت نے کہیں اپنے بارے میں کہا ہے کہ

حسرت سے ملے لیکن حسرت کو نہیں دیکھا

صلاح الدین صاحب میں جو صفات تشکیل پائی تھیں وہ برسوں کی پرورش اور خاموش غیر مرئی ریاض علمی کا نتیجہ تھیں۔اور اس بناء پر اس قدر پیچیدہ تھیں ان کو سیدھے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ویسے ان کی خوش اخلاقی و خوش اطواری بالکل عیاں و ظاہر تھی لیکن اس کے پیچھے ذہنی

سفر کی جو منزلیں اور پیچ در پیچ راہیں تھیں وہ ہمیشہ اوجھل رہیں ۔ اور خود میری معلومات ان کے بارے میں ناقص اور صرف ایک استنباطی قیاس پر مبنی ہیں۔ ممکن ہے ان کے قریبی دوستوں کو ان کا کچھ علم ہو۔ یا پھر دوستوں سے ہٹ کر اس کا اندازہ کچھ ان کے شاگردوں کو ہو سکتا ہے۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں برسوں جو لیکچر دیئے ان میں ضرور ان کے کچھ خدوخال ابھرے ہوں گے۔

۴۔ میں نے خود کوئی خاص کوشش ان سے قریب ہونے کی نہیں کی حالانکہ برسوں ساتھ اٹھا بیٹھا گفتگو کی ان سے شعر سنے اور ان کو شعر سنائے ۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ غیر محسوس طریقے سے ان کی شخصیت میرے ذہن میں اترتی رہی اور آج میں اس شخصیت کو اپنے دل کے نہاں خانے میں اپنے عادتی وقار کے ساتھ متمکن دیکھ سکتا ہوں لیکن اس کی بعینہ عکاسی نہیں کر سکتا۔

۵۔ ایک بڑا گہرا ذہنی تکلف یا Reticence ہمیشہ صلاح الدین صاحب کے مزاج کا جزو رہا اس تکلف کی کنجی میں نے فرصت وفکر کے لمحوں میں ڈھونڈی ضرور ہے لیکن پتہ نہیں اس کو انھوں نے کس طاق میں رکھ دیا تھا کہ ملی نہیں یہ تکلف یا ذہنی ضبط یعنی Restraint صلاح الدین صاحب کے کردار کا بنیادی نقطہ ہے۔ مجھے علم نہیں کہ یہ کب اور کس طرح ان کے مزاج کا جزو بنا تھا، کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ان میں یہہ بات نہیں تھی وہ اپنے عہد کے بہت عمدہ مقرر تھے ۔ ڈھاکہ میں ایک فی البدیہہ تقریری مقابلے میں جس میں طلباء اور اساتذہ دونوں شریک تھے ۔ انہوں نے سب کو شکست دے کر طلائی تمغہ حاصل کیا تھا۔ انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ کے پہلے صدر کی حیثیت سے انھوں نے جو تقریریں کیں وہ یادگار رہیں ۔ لیکن زندگی کی کسی منزل پر انھوں نے اس رکاؤ کو اپنا لیا جو آخر تک ان کے ساتھ رہا۔ کبھی کبھی کسی تقریر میں یہ بند ٹوٹ جاتا تو اس وقت اندازہ ہوتا تھا کہ اسکے پیچھے کیا سیلاب رکا ہوا ہے۔

یہاں میں تعمیر ملت اور اقبال اکیڈیمی کو یہ امتیاز دوں گا کہ انھوں نے ایک گوشہ نشین قلندر کو اس کے حجرے سے نکالا اور اس کی دبی ہوئی قوت فکر اور قوت اظہار کو بہہ نکلنے کا موقع فراہم کیا۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب خلیل صاحب اور ارباب اکیڈیمی کے مشکور ہیں کہ انھوں نے ان کی آخری عمر ہی میں سہی صلاح الدین صاحب کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنی فکر انگیز اور پروقار آواز شہر کے مہذب لوگوں تک پہنچا سکیں۔

۶۔ میرا خیال ہے کہ صلاح الدین صاحب کی شخصیت کا مرکزی سوال یہ ہے کہ انھوں نے کیوں

ساری عمر اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا۔ کبھی کبھی ہم کو یہ خیال ہوتا تھا کہ ان کی قوت تخلیق آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی ہے۔ یہ بات اب صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ جب اقبال اکیڈیمی میں انھوں نے کہنا شروع کیا تو سب کو یہ احساس ہوا کہ پیرانہ سالی میں بھی ان کی فکر توانا اور جاندار ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے گھر کے جلسوں میں وہ کبھی کبھی مذاق مذاق میں جو چیز لکھ جاتے اس میں بھی بڑی گہرائی اور بلند خیالی ہوتی۔ ایک دفعہ انھوں نے بعض دوستوں کے کہنے پر ایک کتاب '' نشتر '' پر ایک تنقیدی مضمون لکھا تھا۔ یہ فارسی میں لکھا ہوا ایک بڑی ہی پر سوز افسانہ عشق ہے۔ جس کا گلبرگہ میں مقیم کسی منشی سجاد حسین کسمنڈیوی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس مضمون کو میرے منجھلے ماموں جلال الدین اشک 'باقی صاحب 'معین الدین قریشی صاحب 'ریس صاحب ' بدر شکیب صاحب وغیرہ نے دیکھا اور ان سب کا خیال یہ تھا کہ اردو میں ایسی تحریر و تنقید مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ لیکن پھر اس کے بعد کبھی کسی سے انھوں نے یہہ بھی کہا تھا کہ نفسیات پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں یا لکھنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی ان کے ذہن کے صفحوں ہی میں رہ گئی۔

۷۔ اس بات کی کئی توجیہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک بات تو یہ کہ صلاح الدین صاحب نے اپنی عمر ایک ایسے سماج میں گذاری جو بنیادی طور پر غیر تخلیقی تھا۔ حیدرآباد نے بڑے عمدہ ذہن پیدا کئے لیکن انھیں فعال بنانے میں کوئی مدد نہیں کی۔ ممکن ہے یہاں کا جاگیرداری نظام اس کا ذمہ دار ہو یا وہ عافیت و آسودگی جو یہاں کے طبقہ شرفا کو حاصل تھی۔ ہندوستان کی بڑی بڑی تحریکیں حیدرآباد کے بازو سے ہو کر نکل جاتیں اور یہ جزیرہ اپنی پر سکون فضاء میں ان سب سے بے نیاز رہتا۔ اس بے تموج ٹھیراؤ کا اور کئی شخصیتیں شکار ہوئیں۔

ایک اور وجہ ہو سکتی ہے کہ صلاح الدین صاحب صرف اعلیٰ ترین تخلیق ہی کے قائل تھے۔ لکھنے کو تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ ہاں کوئی ایسی چیز ہو جو عالمی سطح پر جانچی جا سکے تو پھر اس پر توجہ کرنا مستحب ہے ورنہ تفیح اوقات۔ انھوں نے یہ فراموش کر دیا کوئی شخص اپنی پہلی ہی تخلیق اس معیار کی نہیں پیش کر سکتا بہر حال ان پر وہ بات صادق آتی ہے۔ جو آرنلڈ نے گرے (Gray) کے بارے میں لکھی تھی کہ Gray never spoke out

۸۔ صلاح الدین صاحب کا ذہن قسم اول کا ذہن تھا۔ جن لوگوں نے کبھی کبھی اس ذہن کی جھلکیاں

دیکھی ہیں انھیں اندازہ ہے کہ وہ کس درجہ کا تھا۔ بعد میں انھوں نے یہ طریقہ اپنایا تھا کہ علم کو اپنے اندر اتارتے جائیں۔ ان کا ذہن ایسا تھا جو علم کو مسلسل جذب کرتا جاتا تھا۔ بہت کم ایسے قدح خوار ہوتے ہیں کہ خم کے خم لنڈھا دیں اور قدم اور ذہن میں ذرا سی لغزش نہ آئے۔ صلاح الدین صاحب ایسے ہی لوگوں میں ایک تھے۔ ان کے ظرف نے انھیں ہمیشہ سنبھالے رکھا۔

۹۔ میرا کچھ ایسا احساس ہے کہ وہ مسلسل اپنے آپ کی تخلیق میں مصروف رہے۔ ان کے لئے خود اپنی اور اپنے ذہن کی تہذیب ایک تخلیق کے مماثل تھی۔ اس لحاظ سے ہمارے لئے (کم از کم ان لوگوں کے لئے جو ان کو اچھی طرح جانتے ہیں) صلاح الدین کا سب سے بڑا تحفہ خود صلاح الدین تھے۔ ایک ایسی شخصیت جس میں مشرق و مغرب کی تہذیب کے بہترین عناصر آہستہ آہستہ تحلیل ہو گئے تھے۔

۱۰۔ صلاح الدین صاحب نے سات سال انگلستان اور یورپ میں گذارے تھے۔ وہاں کے بائیں بازو کی تحریکوں میں حصہ لیا تھا۔ آکسفرڈ میں فلسفے کے درس سنے تھے۔ انگلستان میں ان کے ہم عصر سجاد ظہیر، علی یاور جنگ، ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے لوگ تھے۔ آکسفرڈ سے انھوں نے کوئی ڈگری نہیں لی، لیکن جب انگستان سے لوٹے تو ایک پورا کتب خانہ ان کے ساتھ تھا۔ کتابیں اور حقہ ان سے آخر تک نہیں چھوٹے۔ صلاح الدین صاحب کی شخصیت کی حرکت ایک شدید انفرادیت سے جماعت کی طرف رہی ہے۔ میں نے انھیں سے پہلی بار یہ مصرعہ سنا تھا کہ

ہم رنگ جماعت شد تا لذت جاں بینی

شک و الحاد کی منزلوں سے وہ گذر چکے تھے اور آخر عمر میں ان کی طبیعت میں یقین کا اطمینان اور سکون آ گیا تھا۔

صلاح الدین صاحب کے بارے میں، میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں اور مجھے لکھنا بھی چاہیے تھا لیکن فی الحال وقت نہیں اور ظہیر صاحب کا اصرار ہے کہ جو بھی ہو جائے ان کے حوالے کیا جائے۔ لہذا یہ چھوٹا سا خاکہ رواروی میں لکھا گیا ہے۔ صلاح الدین صاحب کا قرض ابھی مجھ پر باقی ہے۔

☆☆☆☆☆

شاہد حسین زبیری

پیکرِ جہد و عمل

(اقبال اکیڈیمی کے نئے صدر محمد ظہیر الدین کا خاکہ)

پروفیسر سید سراج الدین صاحب کے انتقال کے بعد ۹ ستمبر ۲۰۰۶ء کو اقبال اکیڈیمی کے ارکان کی ایک میٹنگ گلشن خلیل میں منعقد ہوی۔ بالاتفاقِ آرا جناب محمد ظہیر الدین صاحب کا انتخاب بحیثیت صدر اقبال اکیڈیمی عمل میں آیا ظہیر صاحب اقبال اکیڈیمی کے قیام کے بعد سے آج تک اکیڈیمی کے ایک خاموش مگر سرگرم کارکن رہے ہیں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سے آپ اپنا مستقل وقت اکیڈیمی کو دیتے ہیں۔ ظہیر صاحب نے اکیڈیمی کی بعض اہم کتابیں مرتب کی ہیں جن میں پروفیسر عالم خوندمیری کی معرکتہ الآرا کتاب اقبال: ''کشش اور گریز'' بھی شامل ہے۔ اقبال ریویو کے کئی شمارے آپکے کاوشوں سے شائع ہوے ہیں جن کا شمار تحقیقی کارناموں میں کیا جاسکتا ہے۔ ظہیر صاحب نام ونمود کے مطلق قائل نہیں۔ جناب شاہد حسین زبیری کا لکھا ہوا یہ شخصی خاکہ اس شمارے میں نئے صدر کے رسمی تعارف کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس خاکے کی پروفیسر سراج نے بھی بہت تعریف کی تھی۔ (ادارہ)

ہوا کا رخ دیکھ کر اڑان بھرنا پانی کا بہاؤ دیکھ کر غوطہ لگانا راستے کے نشیب وفراز کا جائزہ لیکر اپنی راہ کا تعین کرنا صاحب ثروت اشخاص کی لئے میں لئے ملانا اور صاحب اختیار حضرات کی آواز پر لبیک کہنا آج کے دور کے زیادہ تر اشخاص کا شیوہ ہے، مگر اس دور میں کچھ ایسے بھی لوگ گاہے ماہے نظر آجاتے ہیں جنھیں اپنی منزل پر پہنچنے کیلئے نہ ہوا کا رخ نہ پانی کے بہاؤ اور نہ ہی راستوں کے نشیب وفراز کا جائزہ لینے کی حاجت لاحق ہوتی ہے، نہ یہ کسی کے سر میں سر ملاتے ہیں ،اور سوائے حق کی بات کے کسی اور بات پر لبیک نہ کہنے والے یہ لوگ صرف اپنے ضمیر کی آواز پر

چلتے اوران کی منزل صراطِ حق ہوتی ہے۔ایسے لوگ دنیاوی معیارات سے ایک کامیاب زندگی تو نہیں گذارتے مگر حقیقتاً بڑے لوگ یہی ہیں۔چلئے اسی قماش کے ایک شخص سے آج ملتے ہیں۔

صوفیانہ رنگ کا ڈھیلا ڈھالا پتلون بشرٹ یا پھر سفاری سوٹ، کبھی چوڑے پائنچوں کا لٹھے کا پاجامہ، کھادی کا کرتا اور صدری گھنگھر والے الجھے ہوئے بال جنھیں دیکھ کر آسانی سے احساس ہوجاتا ہے کہ ان کا رشتہ کنگھا، تیل اور نائی سے دور دراز کا بھی نہیں رہا، ہاتھ میں ایک چمڑے کا بستہ جو شاید ضرورت سے زیادہ وزنی ہے کیونکہ یہ جس ہاتھ میں بھی ہوتا اس طرف کا کندھا دوسری جانب کے کندھے سے ڈیڑھ دو انچ زیادہ جھکا نظر آتا ہے، یہ حلیہ اردو ادب کی جانی مانی شخصیت اقبال اکیڈیمی کے نائب صدر اور روح رواں، ماہر اقبالیات، ریٹائرڈ ڈویژنل انجینئر الکٹریسٹی بورڈ ظہیر الدین صاحب کے علاوہ کسی اور کا نہیں، شاید اسی قسم کی شخصیات کے لئے اقبالؒ نے یہ شعر کہا تھا۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی موڑ پر آں جناب کا اختلاف اپنے ہر قریبی دوست اور بزرگ سے ہوا ہے خواہ مرحوم قائد ملت سید خلیل اللہ حسینی صاحب رہے ہوں یا جناب مولانا سلیمان سکندر صاحب یا محمد عبدالرحیم قریشی صاحب یا پھر آپ کے نہایت قریبی رفیق مرحوم مصلح الدین سعدی صاحب یا یہ ناچیز راقم تحریر، مگر لطف تو اس وقت دوبالا ہوتا ہے جب کسی جھگڑے کے بعد موصوف اس کا ذکر کسی دوست سے کرتے ہیں کبھی آبدیدہ ہوکر اور کبھی رقت آمیز انداز میں، مگر اس شخص کی برائی نہیں کرتے جس سے جھگڑا ہوا ہو بلکہ اللہ تعالی کا شکر ادا کرتے ہوئے یوں فرماتے کہ میں کیسا خوش قسمت ہوں، مجھے کیسے چاہنے والے نصیب ہیں حالانکہ میں کچھ زیادہ ہی بول گیا مگر میرے دوست نے برا نہیں مانا۔

دیانت داری سے کی جانے والی سرکاری ملازمت، ماشاءاللہ بھرا پرا گھر بچوں کے اسکول اور کالج کے اخراجات، بیماریاں اور ان ضروری اخراجات سے ہٹ کر روزانہ اقبال اکیڈیمی جانے آنے کے اخراجات کا نتیجہ یہ کہ ایک عرصہ تک ظہیر الدین صاحب کے گھر میں ایک بھی بجلی کا پنکھا موجود نہ تھا، ہاتھ کے پنکھوں پر گرمیاں گذرتیں، بعد میں ایک الکٹریکل کنٹراکٹر جس

کوموصوف کی نگرانی میں ، کام ملا تھا اس نے ان کے گھر میں بجلی کے دو پنکھے لگوا دیئے ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظہیر صاحب پنکھا لگوانے والے کے خلاف ہو گئے گھر پر بلایا اور الف تا والسلام شائستگی سے جس قدر نواز سکتے تھے نواز دیا وہ بھی بڑا ڈھیٹ نکلا اس نے کہا ''خفا کائیکو ہوریں صاب قسطوں میں پیسے دے دینا ،، اتفاقاً میں بھی وہاں موجود تھا میں نے مخل ہو کر کہا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے اس بہانے چلئے گھر میں گرمی کا سد باب تو ہو گیا ، اقساط میں پیسے چکا دیجئے ، پنکھوں کی قیمت دریافت فرمائی گھر کے اندر گئے اور سوا پنکھے کی قیمت اسی وقت ادا کر دی پھر حساب کر کے فرمایا میری تنخواہ نو (۹) دن بعد ملے گی باقی پیسے آ کر لے جانا۔

ایک روز میں موصوف کے دفتر واقع منٹ کمپونڈ چلا گیا باتوں باتوں میں کسی بات پر مجھ سے کہنے لگے یہ آپ مجھے لکھ کر دے دیجئے ، میں نے موصوف کی میز پر رکھا قلم اٹھایا اور کاغذ اپنی طرف کھینچا تھا کہ میری حرکت دیکھا کر کہنے لگے کیا کر رہے ہیں یہ سرکاری کاغذ ہے ، اسے ذاتی کام کے لئے استعمال نہیں کرتے اور پھر اپنا بستہ کھول کر کاغذ قلم نکال کر میری طرف بڑھا دیا میں نے دریافت کیا ظہر صاحب کا غذ قلم تو اپنا دے دیا مگر یہ وقت جس میں ہم غیر سرکاری باتیں کر رہے ہیں اس کا کیا ؟ یہ تو سرکاری ہے اس کا آپ کے پاس کیا جواز ہے ، سن کر کہنے لگے میں اوسطاً دو گھنٹے اپنے وقت سے زائد سرکاری کام کرتا ہوں ، جس کا مجھے کوئی معاوضہ نہیں ملتا اس لحاظ سے قریباً پچاس گھنٹے مہینے میں ، میں بلا معاوضہ کام میں مصروف رہتا ہوں اور سرکاری اوقات میں مہینے بھر میں میرے ذاتی کام یا گفتگو میں بارہ پندرہ گھنٹوں سے زائد خرچ نہیں ہوتے لہذا میں اپنے تئیں مطمین ہوں ، یہ ہے موصوف کی فطرت عالی ،

بحیثیت نائب صدر اقبال اکیڈیمی انھوں نے اپنا یہ فریضہ بنا رکھا ہے کہ کم از کم مہینے میں ایک جلسہ اقبال پر ضرور ہو ، جلسہ منعقد کرنے کے لیے چار چیزوں کی بڑی اہمیت ہے۔ جلسے کے دن ہال کی صفائی ستھرائی اور کرسیوں کا رکھنا ، پھر جو موضوع قرار دیا گیا ہے اس کے لیے کوئی مقرر اور صدارت کے لیے ایک صدر اور سامعین ۔

بعض اوقات ہال کی صفائی ستھرائی کیلئے کوئی میسر نہ ہو تو بڑی خوش دلی سے ظہیر صاحب تنہا یہ کام کر لیتے ہیں ، اور کوئی صدارت کے لیے نہ ملے تو اس دن موصوف یہ کارنمایاں بھی انجام دے لیتے ہیں ، اور جس دن مقرر نصیب نہ ہو تو تقریر کی ذمہ داری بھی قبول کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ،

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ سب کچھ ہوتا اور سامعین ندارد تو بہت ہی سنجیدگی سے سامع کا فرض بھی ادا کر دیتے،

ظہیر صاحب کی خوشی اس دن زیادہ ظاہر ہوتی جس دن سامعین سے ہال کھچا کھچ بھر جاتا مقرّرین بھی ہوتے اور صدارت کے لیے بھی کوئی موزوں شخص مل جاتا اس دن ظہیر صاحب انتہائی مسرور دکھائی دیتے بحیثیت نائب صدر اقبال اکیڈیمی کبھی شہ نشین پر تشریف فرماتے مگر ہائے ری قسمت کبھی نچلا بیٹھنا اس دن بھی نصیب نہ ہوتا، مرحوم عالم خوندمیری کی انگلیوں میں دبی سگریٹ دیکھتے اور جی میں خیال آتا شاید ان کے پاس دیا سلائی نہیں ہے، فوری اپنی جگہ سے اٹھ کر کسی سے دیا سلائی فراہم کر کے عالم صاحب کی مشکل آسان کر دیتے، کبھی محسوس ہوتا کہ سامعین تک آواز صاف نہیں پہنچ رہی ہے تو فوراً اپنی نشست سے اٹھ کر ہال کے کونے میں کھڑے ہو کر سنتے کہ آواز یہاں تک پہنچ رہی ہے یا نہیں، اور پھر مائیک پر آ کر اسے درست کرنے لگتے' کبھی دیکھتے کہ ہال میں کوئی پنکھا چل نہیں رہا ہے تو فوری ایک ٹیبل فیان کا انتظام کر دیتے، المختصر موصوف کو کبھی شہ نشین پر سکون سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا'

انھیں اقبال اکیڈیمی کے لیے کتابیں جمع کرنے کا جنون سا ہے کہیں سے اطلاع ملتی کہ فلاں شخص کے پاس چار کتابیں ہیں جو وہ کسی ادارے کو نذر کرنا چاہتا ہے تو یہ ہرگز نہ سوچتے کہ اس کا مکان کتنے فاصلے پر ہے، چار کتابیں اقبال اکیڈیمی کے لیے حاصل کرنے چالیس کوس کا سفر کرنا جناب والا کے لیے کار محال نہ ہوتا، آج اسی کا نتیجہ ہے کہ ماشاء اللہ اقبال اکیڈیمی کے پاس پینتیس ہزار سے زائد کتب موجود ہیں اور الحمدللہ آج حیدرآباد کی اقبال اکیڈیمی دنیا کے کسی بھی کونے میں قائم اقبال اکیڈیمی سے کم نہیں۔

میں اس کی کامیابی کا سہرا صرف ظہیر الدین صاحب کے سر نہیں باندھ رہا اکیڈیمی کو اس بلندی تک لانے میں کئی اشخاص نے اپنا خون پسینہ صرف کیا ہے چند اہم نام قابل ذکر ہیں۔ محترم جناب سید خلیل اللہ حسینی مرحوم، موجودہ صدر تعمیر ملت عبدالرحیم قریشی صاحب، مرحوم مصلح الدین سعدی صاحب، زکریا شریف صاحب، پروفیسر عالم خوندمیری صاحب مرحوم، پروفیسر سراج الدین صاحب وغیرہ۔

مگر جو مجنونانہ تعلق ظہیر صاحب کا اکیڈیمی سے رہا ہے، وہ شاید کسی اور کا رہا ہو اگرچہ راقم

تحریر نے بھی اکیڈیمی کو کئی اہم کتابیں دلوائی ہیں۔ اس کے باوجود گر مجھے کسی کتاب کی ضرورت لاحق ہوتو مجھے بھی رجسٹر میں اپنا نام درج کئے بغیر کتاب میسر نہیں ہوسکتی۔

عرصہ قبل مجھے کہیں سید ضمیر جعفری کی نظم ''کلرک نامہ،، پڑھنے کا اتفاق ہوا جس سے استفادہ کرتے ہوئے ناچیز نے ایک ظہیر نامہ لکھا ہے'،، ملاحظہ ہو

اللہ نے جب ازل میں بنایا ظہیر کو — اقبال کا ہی درس پڑھایا ظہیر کو
جاوید نامہ ،بانگ درا سب پڑھا دیا — اقبال کے کلام کا عاشق بنادیا
پھر فیصلہ کیا کہ اتارو زمین پر — اقبال اکیڈیمی لکھا ان کی جبین پر
نام خدا ظہیر میاں جب جواں ہوئے — اقبال اکیڈیمی کے یہ روح رواں ہوئے
پھر ڈائس پر اٹھایا بٹھا یا ظہیر کو — اقبالیوں کے بیچ پھنسایا ظہیر کو
اقبال کی ڈگر کے علمدار ہوگئے — مونسپلٹی کے روڈ پہ بیکار ہوگئے
ابلیس راستے میں ملاورغلا دیا — برقی کے بورڈ کا انھیں رستہ دکھادیا

آج کل ظہیر صاحب کچھ تھکے تھکے سے نظر آتے ہیں میری اللہ تبارک تعالی سے دعا ہے کہ انھیں صحت وتندرستی کے ساتھ اقبال اکیڈیمی کی خدمت پر مامور رکھے۔ آمین ثم آمین

ظہیر صاحب پر حسرت موہانی مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے

غیر کی جدوجہد پر تکیہ نہ کرکہ ہے گناہ
کوشش ذات خاص پرناز کراعتماد کر

☆☆☆☆

اقبال اکیڈیمی کا خبر نامہ

1۔ پروفیسر سید سراج الدین کا سانحۂ ارتحال

اکیڈیمی کا اظہار تعزیت

پروفیسر سید سراج الدین صدر اقبال اکیڈیمی ۱۵ر جولائی ۲۰۰۶ء کو مختصر علالت کے بعد ۸۲ سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے گزر جانے سے نہ صرف اکیڈیمی بلکہ حیدرآباد کی علمی و ادبی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ نماز جنازہ مسجد قطب شاہی مہدی پٹنم میں ۱۶ر جولائی ۲۰۰۶ء کو ادا کی گئی اور متصل قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور مقامات اعلیٰ سے سرفراز فرمائے۔ آمین

ان کے سانحہ ارتحال پر اقبال اکیڈیمی کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں جناب محمد ضیاء الدین نیّر، معتمد جناب سید امتیاز الدین شریک معتمد، جناب محمد عمر علی خاں کارگذار صدر اسلامک ہرٹیج فاؤنڈیشن، جناب سید محمود قادری اور دیگر رفقاء موجود تھے۔ جناب محمد ظہیر الدین نائب صدر جو ان دنوں حیدرآباد سے باہر تھے اپنے تعزیتی بیان میں سراج صاحب کے انتقال پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا۔

تعزیتی جلسہ

پروفیسر سید سراج الدین صاحب کے سانحہ ارتحال پر تعزیتی جلسہ کا انعقاد عمل میں آیا جس کا اہتمام اقبال اکیڈیمی حیدرآباد اور اسلامک ہرٹیج فاؤنڈیشن نے کیا۔ اس جلسہ کی صدارت جناب محمد ظہیر الدین صدر اقبال اکیڈیمی نے کی۔

اس موقع پر محمد ضیاء الدین نیر معتمد اقبال اکیڈیمی نے ایک قرارداد پیش کی،

قرارداد تعزیت میں جذبات رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے کہا گیا کہ ''ہمارا شہر حیدرآباد ایک نامور دنشور اور اعلی پایہ کے محقق نقاد، ادیب اور شاعر سے محروم ہوگیا۔ پروفیسر سراج الدین صدر اقبال اکیڈیمی کا انتقال علمی ،ادبی دنیا کا ایک بڑا سانحہ ہے۔اکیڈیمی مرحوم کے غم میں سوگوار ہے۔سراج صاحب کسر نفسی ، سادگی اور شرافت و انکسار اور تبحر علمی کے اعتبار سے ایک جامع شخصیت کے مالک تھے۔وہ نفاست پسند اور سلیم الطبع ہونے کے ساتھ ساتھ ہمدرد اور خوش مزاج انسان تھے۔انہی اوصاف کی بناء پر وہ حیدرآباد کے علمی حلقوں میں مقبول تھے۔انکا حلقہ احباب نہایت وسیع تھا۔انکی کتابیں اور بیشمار مضامین اور علمی محافل کے صدارتی تجزیے اور تبصرے انکے مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کے آئینہ دار ہیں۔

ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالی انہیں جنت النعیم میں جگہ عطا فرمائے اور جمیع پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔''

پروفیسر تقی علی مرزا نے کہا کہ سید سراج الدین صاحب کا مطالعہ وسیع تھا۔ان کو کئی زبانوں میں عبور اور شغف تھا۔ان کی فارسی دانی بھی مسلمہ تھی۔لیکن انکی طبع شرافت اور منکسر المزاجی کی وجہ سے انہوں نے وہ شہرت حاصل نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔شاندار قابلیت اور اعلی درجہ کی لیاقت کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ پیچھے رکھا۔وہ اقبال کے عاشق تھے۔اور ان کی شخصیت ہر لحاظ سے دلکش تھی۔پروفیسر تقی نے اقبال اکیڈیمی سے خواہش کی کہ وہ سراج صاحب کے جاوید نامہ کے ترجمہ کی اشاعت کا اہتمام کرے۔

پروفیسر بیگ احساس نے سراج صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ غلو کو پسند نہیں کرتے تھے اور تنقید کو قبول کرتے تھے۔انکی شخصیت میں بانکپن تھا جو کم دانشوروں میں پایا جاتا ہے۔پروفیسر بیگ احساس نے کہا وہ اقبال کے پرستار تھے لیکن وہ معروضی مطالعہ کے قائل تھے۔جناب مضطر مجاز نے جو خود جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ کر چکے ہیں پروفیسر سید سراج الدین کے جاوید نامہ کے ترجمہ کو سراہتے ہوئے کہا کہ وہ ماڈرن ڈکشن میں ہے۔مضطر صاحب نے کہا کہ سراج صاحب بڑے سادگی پسند تھے۔غرور علم نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی۔ڈاکٹر یوسف اعظمی نے کہا کہ سراج صاحب روشن خیال تھے اور ان کے پاس ہمہ لسانی شعور تھا۔

مولانا سلیمان سکندر صاحب نائب صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت نے پروفیسر سید سراج

الدین کی ولآویز شخصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ عالم خوندمیری صاحب کے بعد سراج صاحب کی شخصیت مطالعہ اقبالیات میں ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ جناب محمد عبدالرحیم قریشی صاحب صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت نے کہا کہ پروفیسر سید سراج الدین صاحب نے پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ گزشتہ چودہ سال سے اقبال اکیڈیمی کے سربراہ کی حیثیت سے فرائض انجام دئے۔ جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب مرحوم نے عالم خوندمیری صاحب اور سراج صاحب کو اقبال اکیڈیمی سے قریب کیا تھا۔ جناب رحیم قریشی صاحب نے کہا کہ اقبال اکیڈیمی سراج صاحب کی کتابوں کی اشاعت کا جلد از جلد اہتمام کرے۔ جناب محمد عمر علی خاں صاحب نائب صدر اسلامک ہریٹیج فاؤنڈیشن نے بھی مخاطب کیا۔ جناب محمد ظہیر الدین صاحب نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے سراج صاحب کے انتقال کو نہ صرف اکیڈیمی بلکہ ذاتی نقصان قرار دیا۔ اور یہ تیقن دیا کہ اکیڈیمی کی جانب سے انشاء اللہ ان کی شخصیت پر اقبال ریویو کے خصوصی شمارہ اور جاوید نامہ کا ترجمہ شایع کیا جائے گا۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر معتمد اکیڈیمی نے نظامت کے فرائض انجام دئے۔ ان کے شکریہ اور دعا پر اس تعزیتی جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔ اس موقع پر اہل علم دوستوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔

۲۔ اقبال اکیڈیمی کی جنرل باڈی میٹنگ

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے بانی اراکین اور لائف ممبرس کا ایک اجلاس گلشن خلیل کی زیریں منزل میں بصدارت جناب محمد عبدالرحیم قریشی صاحب کے از اولین ارکانِ اساسی منعقد ہوا۔ جناب ضیاء الدین نیر صاحب نے مختلف شعبہ جات میں اقبال اکیڈیمی کی کارکردگی رپورٹ اور تنقیح شدہ آڈٹ رپورٹ پیش کی۔ اراکین اجلاس نے اس رپورٹ کی توثیق کی۔ اسی اجلاس میں بعض قواعد وضوابط میں ضروری ترمیمات پیش کی گئیں۔ پروفیسر سید سراج الدین صاحب سابق صدر اقبال اکیڈیمی کی رحلت کی وجہ سے مخلوعہ نشست کو پر کرنے کے لئے اراکین نے بالاتفاق محمد ظہیر الدین صاحب کو صدر اقبال اکیڈیمی منتخب کیا۔ جناب ضیاء الدین نیر صاحب کا بحیثیت نائب صدر اور سید امتیاز الدین صاحب کا بحیثیت معتمد انتخاب عمل میں آیا۔ اس جلاس میں ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب، پروفیسر یوسف کمال، جناب محمد عمر علی خاں

کارگذار صدر اسلامک ہرٹیج فاؤنڈیشن' ڈاکٹر محمد عبدالمنان سابق پروفیسر عثمانیہ انجینیر نگ کالج، شیخ سعد حسین صاحب آئی۔اے۔ایس ریٹائرڈ، محمد خورشید الحسن موظف گرینڈلیز بنک، ڈاکٹر یوسف اعظمی، محمد اسحاق صاحب اور احمد ابوسعید صاحب نے جلسہ کی کاروائی میں حصہ لیا۔اور تجاویز وترمیمات پیش کیں۔ جناب محمد ظہیر الدین صاحب نومنتخب صدر اقبال اکیڈیمی نے سابق صدور جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب بانی اقبال اکیڈیمی، پروفیسر عالم خوندمیری اور پروفیسر سید سراج الدین صاحب مرحوم کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی چھوڑی ہوئی اعلی روایات کی پاسداری کا تیقن دلایا اور اس سلسلے میں معزز ارکین سے تعاون کی درخواست کی۔انھوں نے ممتاز ماہر اقبالیات وعالم ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کے اس تبصرہ کا ذکر کیا کہ Iqbal Academy is mission with a vision۔

جناب محمد عبدالرحیم قریشی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ موجودہ عالمی اور ملکی حالات کے تناظر میں اقبال کی معنویت کو پیش کرنے کی ضرورت ہے اور نئی نسل میں پیام اقبال کو آسان زبان میں روشناس کرانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

جناب محمد ضیاء الدین نیر صاحب کے شکریہ پر یہ محفل اختتام کو پہنچی۔

۳۔اقبال اکیڈیمی میں لفٹ کی تنصیب

الحمد للہ گلشن خلیل، تالاب ماں صاحبہ میں جہاں اقبال اکیڈیمی اور اسلامک ہرٹیج فاؤنڈیشن جیسے اہم علمی ادارے واقع ہیں لفٹ کی تنصیب عمل میں آچکی ہے۔

۸/اکتوبر ۲۰۰۶ء مطابق ۱۴/رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ کو محترم ڈاکٹر سید عبدالمنان نے لفٹ کا افتتاح کیا۔اس موقع پر ایک منتخب اجتماع کا انعقاد عمل میں آیا، جس کی صدارت جناب محمد ظہیر الدین نے کی۔ جناب محمد عبدالرحیم قریشی صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت وگلشن خلیل ٹرسٹ' جناب محمد عمر علی خان کارگزار صدر اسلامک ہرٹیج فاؤنڈیشن نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا لفٹ کی تنصیب سے ایک ضرورت کی تکمیل تو ہی گئی ہے لیکن ساتھ ہی اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ جناب سید امتیاز الدین نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

لفٹ کے افتتاحی اجلاس میں محمد عمر علی خاں کا رگزار صدر
اسلامک ہریٹیج فاؤنڈیشن کی خیر مقدمی تقریر

جناب صدر محمد ظہیر الدین صاحب صدر اقبال اکیڈیمی و مہمانان خصوصی
محترم ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب، جناب محمد عبدالرحیم قریشی صاحب صدر کل ہند مجلس ملت و صدر نشین، گلشنِ خلیل ٹرسٹ، اور معزز سامعین۔

السلام علیکم

میں اس مختصری خوش گوار محفل میں آپ سب کی شرکت کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اقبال اکیڈیمی کے کتب خانے میں اسکالرس اور وزیٹرس کی آمد و رفت میں عرصہ دراز سے دشواری محسوس کی جارہی تھی۔ اس کے علاوہ اسلامی تہذیب و ثقافت، سائنس و حکمت کے بارے میں فاؤنڈیشن کے تحت اکٹھا ہونے والے ذخیرے سے استفادہ کے خواہش مند بھی تیسری منزل پر آنے میں دشواری محسوس کررہے تھے۔ اس کے علاوہ سیمینار اور مذاکرات پر مبنی لکچرس میں زیادہ تر معمر ادبی ذوق رکھنے والے شایقین شرکت سے معذرت خواہ تھے۔ اس ضرورت کو محترم ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب نے اولیت دی اور اس کے لئے وسائل کی فراہمی کے لئے آگے بڑھے۔ یوں تو وہ اپنے پیشہ طب کی وجہ سے بیماروں اور کمزوروں کو صحت مند بنانے میں شہرت رکھتے ہیں لیکن کئی لوگ اس بات سے بھی واقف ہیں آپ ملت کے فلاحی اور رفاہی کاموں کو بھی قوت بخشتے ہیں۔ ان کی خدمات کچھ کم نہیں، ہر قدم پر انکی رہنمائی شامل حال رہتی ہے۔

اللہ سبحانہ تعالی انھیں جزاے خیر عطا فرمائے۔ جناب عبدالرحیم قریشی صاحب صدر نشین خلیل ٹرسٹ کے تعاون کے لئے بھی میں ممنون ہوں جنہوں نے نہ صرف تنصیب لفٹ کی اجازت دی بلکہ لفٹ ویل کی تعمیر میں بھی مالی تعاون فرمایا۔ جن اصحاب خیر خصوصاً جناب محمد ضیاء الدین نیر صاحب نائب صدر اکیڈیمی اس کام کیلئے مالیہ فراہم کیا ہے ان سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ لفٹ کی سہولت کی فراہمی نے اکیڈیمی اور فاونڈیشن کے کاموں میں اضافہ کردیا ہے۔ اقبال اکیڈیمی کا کتب خانہ وقیع شکل اختیار کرچکا ہے۔ اس کی تہذیب، آراستگی اور تنظیم کے سلسلہ میں بہت کچھ کام ہونا باقی ہے۔ اسی طرح اسلامی تہذیب و تمدن،

اسلامی آرٹ وثقافت، سائنس اور حکمت کے بارے میں موجود ذخیرہ کو جدید اسلوب سے قابل پیش کش بنانا ہے۔ اس میں اضافہ کرنا ہے اور نئی نسل کو اس سے متعارف کروانا ہے۔ اس سلسلہ میں معزز ارکان، احباب اور مخلصین کے تعاون سے انشاء اللہ بتدریج یہ کام تکمیل پاسکیں گے۔ ان اداروں نے جو دائیرہ عمل اپنے لئے اختیار کیا ہے وہ خاموشی اور مستقل مزاجی چاہتا ہے اور اس کام سے دلچسپی رکھنے والوں کا ایثار چاہتا ہے۔ رفتار کار میں اضافہ کے ساتھ مالی وسائل بھی ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

لفٹ کی تنصیب کے سلسلہ میں سیول ورک کی تکمیل Reliance Builders کے توسط سے انجام پائی جس کے لئے میں شری سرینواس راؤ، شری پورنا چندرا راؤ (M.D) اور شریک کار شری ستیہ نارائن کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے شب وروز کی مساعی سے اس کام کی تکمیل کی۔

آخر میں ان بزرگ سرپرستوں اور رفقاء کیلئے دعائے مغفرت کرتا ہوں جو لفٹ کی تنصیب کے سلسلہ میں فکرمند رہے لیکن جو آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ میری مراد پروفیسر سراج الدین، پروفیسر جعفر نظام، جناب سید عبدالولی قادری، جناب مصلح الدین سعدی اور جناب الطاف حسین سے ہے۔ جنہوں نے ان اداروں کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔

میں دوبارہ آپ تمام شرکاء صاحبین اور ادب دوست اصحاب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

۴۔ اجتماعات

گذشتہ ۶ ماہ کے عرصے میں اقبال اکیڈیمی حیدرآباد اور اسلامک ہیریٹیج فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام حسب ذیل اجتماعات کا انعقاد عمل میں آیا۔

(۱) ۲۳/اپریل ۲۰۰۶ء

توسیعی تقریر جناب مضطر مجاز

موضوع: حضورِ رسالتؐ (ارمغان حجاز)

صدارت: پروفیسر سید سراج الدین صاحب صدر اقبال اکیڈیمی

(اہتمام: اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

(ب) ۱۸/جون ۲۰۰۶ء

توسیعی تقریر: ڈاکٹر یوسف اعظمی

وائس پرنسپل شاذ کالج آف انجینئرنگ

موضوع : اسلامی ثقافت اور مغربی تہذیب

صدارت: پروفیسر سید سراج الدین صاحب صدر اقبال اکیڈیمی

اہتمام: اسلامک ہیریٹیج فاؤنڈیشن

(ج) ۱۹/اگست ۲۰۰۶ء) شنبہ

تقریب رسم اجراء ''عکس خطوط اور زاویے''

مصنف : ڈاکٹر اوصاف احمد سابق صدر شعبہ تحقیقات اسلامک ڈیولپمنٹ بنک جدہ سعودی عرب

صدارت: ڈاکٹر احتشام حسنین

وائس چانسلر سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد

بمقام۔ ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد

اہتمام: اقبال اکیڈیمی بہ تعاون ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

(د) ۲۰/اگست ۲۰۰۶ء

توسیعی تقریر : ڈاکٹر اوصاف احمد سابق صدر شعبہ تحقیقات اسلامک ڈیولپمنٹ بنک جدہ سعودی عرب

موضوع : مسلمانان ہند کے موجودہ تعلیمی اور معاشی مسائل۔ چیلنجس اور راہ عمل

صدارت: ڈاکٹر شفیق الزماں آئی اے ایس

پرنسپل سکریٹری حکومت آندھرا پردیش

(ہ) ۲۱/اگست ۲۰۰۶ء

توسیعی تقریر ڈاکٹر اوصاف احمد سابق صدر شعبہ تحقیقات اسلامک ڈیولپمنٹ بنک جدہ سعودی عرب

موضوع : کلام اقبال میں انسان دوستی

صدارت: جناب زاہد علی خان مدیر اعلیٰ روزنامہ سیاست حیدرآباد

بمقام سیاست گولڈن جوبلی ہال روزنامہ سیاست، حیدرآباد

اہتمام: اقبال اکیڈیمی بہ تعاون ادارہ سیاست

۵۔ کتب خانہ

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے کتب خانہ میں اس ۶ ماہ کے عرصہ میں گرانقدر کتب ورسائل کا اضافہ ہوا۔ جن اداروں اور اصحاب خیر نے کتابیں تحفۃً مرحمت فرمائیں ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

اسمائے گرامی	تعداد کتب ورسائل
۱۔ ڈاکٹر محمد مشتاق علی	132
بہ یاد جناب محمد اکرام الدین وہاج	
۲۔ جناب حبیب احمد علی	112
۳۔ جناب راشد علی صفوی	211
بہ یاد محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر	
۴۔ مطبوعات دار الفکر لاہور	
(مغربی مسلم مفکرین کی انگریزی کتابیں)	101
بہ حسن توسط ڈاکٹر محمد سہیل عمر	
۵۔ ڈاکٹر اوصاف احمد (دہلی)	45
۶۔ جناب عبدالقیوم عادل	21
۷۔ مطبوعات اقبال اکادمی پاکستان	69

اس سے قبل جنوری ۲۰۰۶ء تا مارچ ۲۰۰۶ء کے عرصہ میں حسب ذیل معاونین نے کتابیں مرحمت فرمائیں۔

۱۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ (25)

۲۔Institute of Persian studies(36)

۳۔ جناب حامد انصاری (56 کتب، 57 رسائل)

۴۔ جناب مجتبیٰ حسین (کلیات پریم چند 24، جلدوں کے علاوہ کتب ورسائل (50)

۵۔جناب محمد عبدالرحیم قریشی

مذکورہ بالا ہمدردوں کے علاوہ محترمہ ثمینہ یاسمین صاحبہ، جناب نصرالحق، ڈاکٹر سید عبدالمنان نے کتابیں عنایت فرمائیں۔

(و) شارجہ میں اقبال پر محمد ظہیر الدین صاحب کے لکچرس

جناب محمد ظہیر الدین اپنے بچوں سے ملاقات کے لے شارجہ میں مئی، جون اور جولائی کے دوران ڈھائی ماہ مقیم رہے۔ان کی آمد کی اطلاع ملنے پر باذوق حضرات نے اقبال پر ان کی تقاریر کا اہتمام کیا۔ جملہ سات نشستیں منعقد ہوئیں۔ جناب محمد اعظم، جناب محمد اظہر الدین، جناب سہیل، جناب ریاض نے ان محفلوں کے انعقاد میں حصہ لیا۔ شارجہ کے قیام کا حاصل جناب محمد عظیم الدین (مسافر) مجیب الرحمٰن جیجون سے ملاقاتیں تھیں۔ دونوں سافٹ ویر انجینئر اور ہونہار نوجوان ہیں ،ان کا ذریعہ اظہار انگریزی ہے۔

ڈاکٹر کریم رضا سابق معتمد اقبال اکیڈیمی کا سانحہ ارتحال:

اقبال ریویو کا زیر نظر شمارہ طباعت کے مرحلے میں تھا کہ ۱۸/نومبر ۲۰۰۶ء کی صبح ڈاکٹر کریم رضا کے پر ملال انتقال کا سانحہ پیش آیا تعمیر ملت میں مرحوم نے معتمد دفتر سے لیکر نائب صدارت اور معتمد عمومی کی ذمہ داریاں بحسن خوبی انجام دیں مرحوم اقبال اکیڈیمی کے معتمد بھی رہے انہوں نے اقبال پر ڈاکٹریٹ کیا تھا وہ انتہائی خوش مزاج اور ہر دلعزیز تھے جناب محمد ظہیر الدین صدر اکیڈیمی کے بہنوئی تھے۔

ادارہ دعا گو ہے کہ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے اور مقاماتِ اعلیٰ سے سرفراز فرمائے۔آمین

☆☆☆☆

پروفیسر سید سراج الدین پروفیسر انا ماری شمل کا خیر مقدم کرتے ہوئے۔ جناب ڈبلیو میسنر (Mr.W.Miessner) ڈائرکٹر میکس طربھون بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ (۲۵/اکتوبر ۱۹۸۰ء)

پروفیسر جعفر نظام، پروفیسر سید سراج الدین۔ روح اقبال کے ساتویں ایڈیشن کی اجرائی کے موقع پر (جنوری ۱۹۹۸ء)

دائیں سے بائیں: پروفیسر علی محمد خسرو، پروفیسر سید سراج الدین، پروفیسر افضل محمد اور جناب سید محمد مصلح الدین سعدی۔ (جولائی 2002ء)

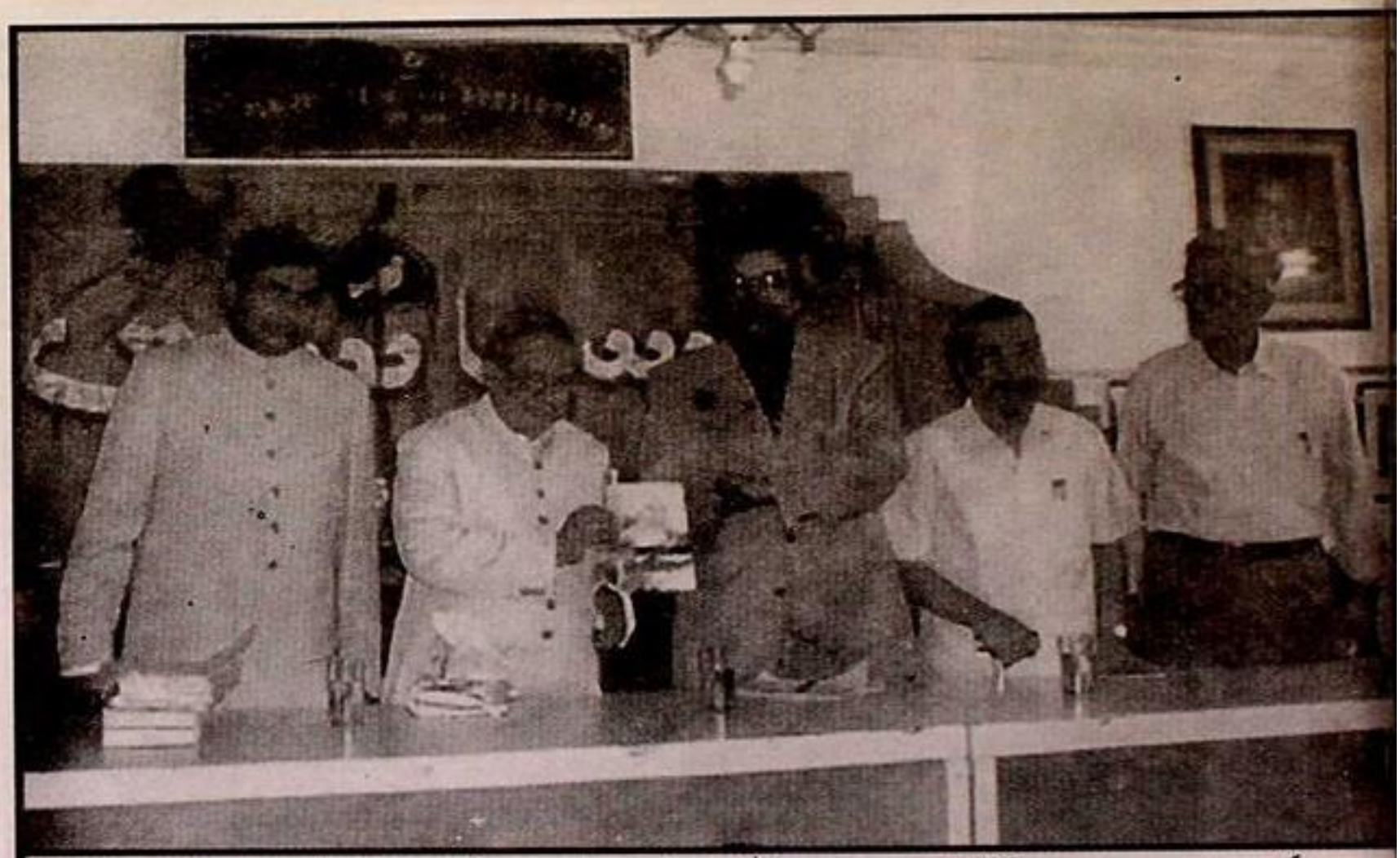

دائیں جانب سے: جناب مجتبیٰ حسین، جناب محمد ظہیر الدین، جناب زاہد علی خان، پروفیسر اوصاف احمد، جناب محمد ضیاء الدین نیر، بمقام سیاست جوبلی ہال، پروفیسر اوصاف احمد کی توسیعی تقریر اور کتاب کی رسم اجرا۔ زیر اہتمام اقبال اکیڈیمی حیدرآباد۔ (۲۱/اگست ۲۰۰۶ء)

افتتاح لفٹ کا افتتاح، ۸/اکتوبر ۲۰۰۶ء ۱۴/رمضان المبارک ۱۴۲۷ھ ۔اتوار۔دائیں سے بائیں، جناب محمد عبدالرحیم قریشی صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت، جناب سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی، جناب محمد عمر علی خان ب صدر نائب صدر اسلامک ہیریٹج فاؤنڈیشن، ڈاکٹر سید عبدالمنان، جناب متین الدین قادری، جناب احمد علی۔

ڈاکٹر سید عبدالمنان فیتہ کاٹ کر اقبال اکیڈیمی کی لفٹ کا افتتاح کرتے ہوئے۔ تصویر میں جناب محمد ظہیر الدین صدر اقبال اکیڈیمی اور جناب محمد عمر علی خان نائب صدر اسلامک ہیریٹج فاؤنڈیشن بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ (لفٹ کا افتتاح، ۸/اکتوبر ۲۰۰۶ء)

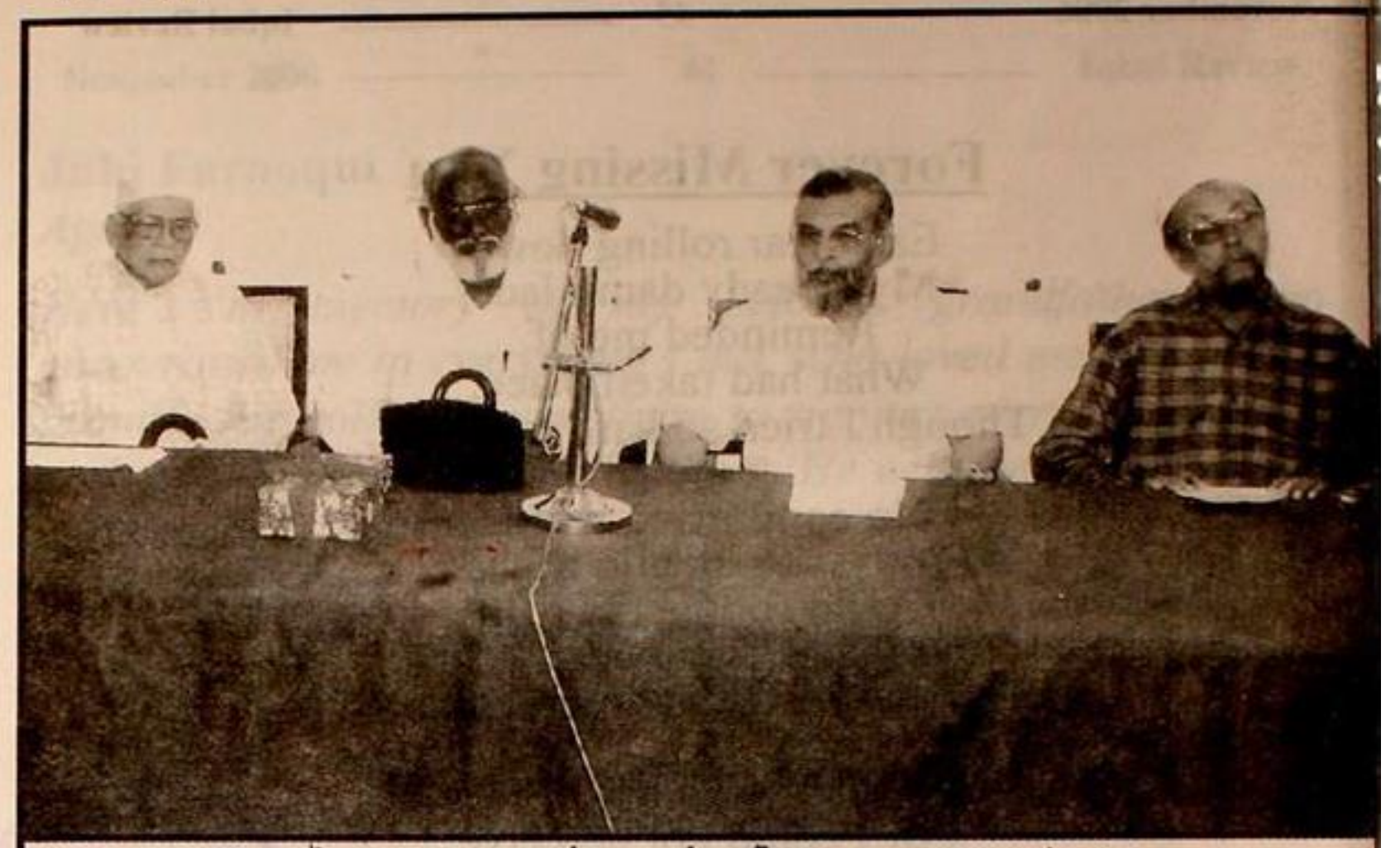

اقبال اکیڈیمی کی لفٹ کے افتتاح کے موقع پر دائیں سے بائیں سید امتیاز الدین، محمد ظہیر الدین صدر اقبال اکیڈیمی، عبدالرحیم قریشی صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت، ڈاکٹر سید عبدالمنان۔

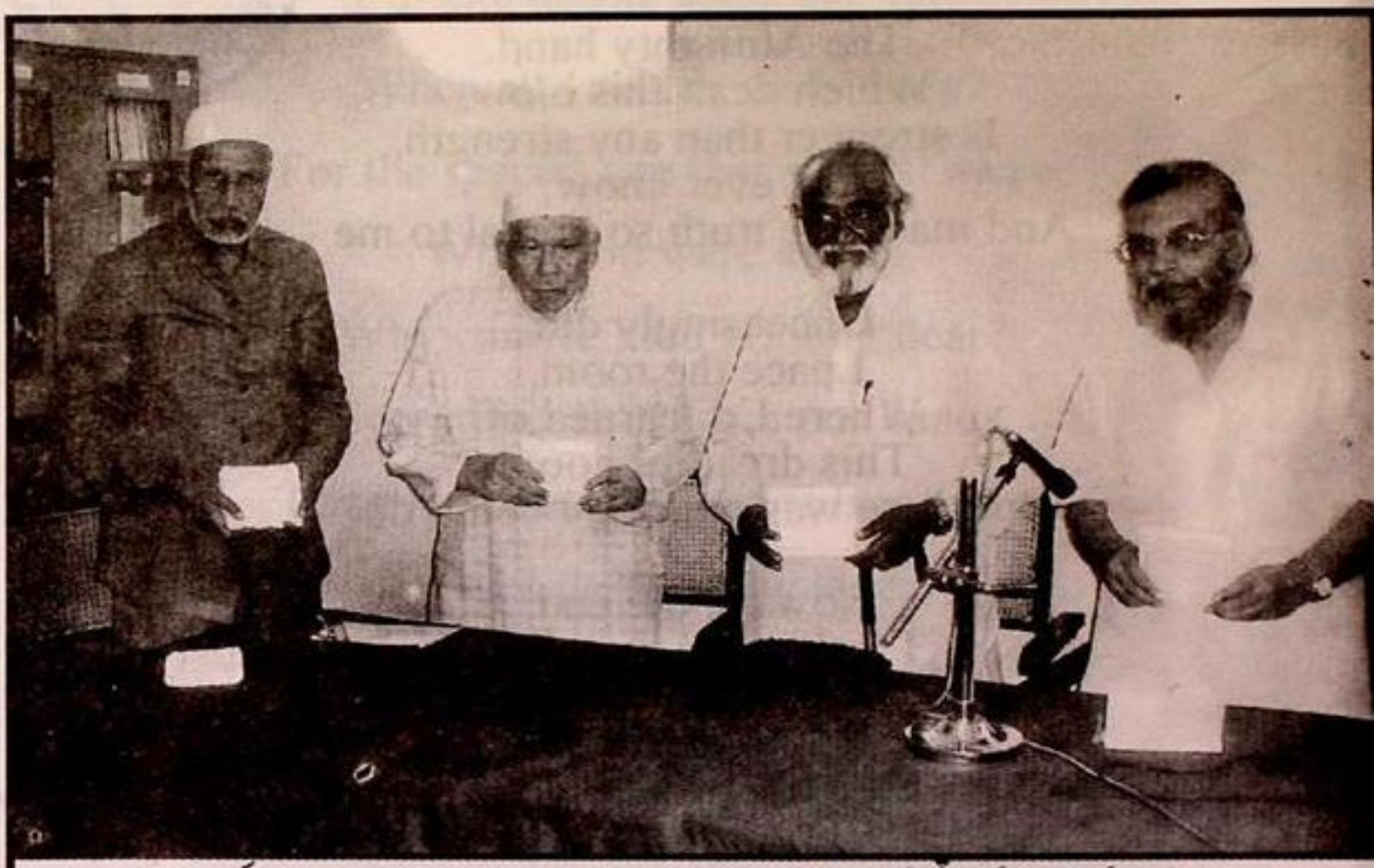

لفٹ کے افتتاح کے موقع پر کتاب Islamic Enlightenment for Every Day کی رسم اجرا، دائیں سے بائیں: جناب محمد ظہیر الدین صدر اقبال اکیڈیمی، جناب عبدالرحیم قریشی صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت، ڈاکٹر سید عبدالمنان، جناب محمد عمر علی خان نائب صدر اسلامک ہیریٹج فاؤنڈیشن۔

Forever Missing You

Each tear rolling down,
My already damp face,
Reminded me of,
What had taken place,
Though I tried so hard to forget.

No comforting words,
From sympathetic friends,
Could soothe the pain,
That the grieving heart sends,
Or soften my regret.

I heard with dry eyes,
For I could not perceive,
My mind became numb,
And my senses took leave,
I simply could not let it be.

The Almighty hand,
Which dealt this blow,
Is stronger than any strength,
I'll ever know,
And made the truth so unreal to me.

Unceasingly did,
I pace the room,
Where I'd learned of,
This dreadful doom,
But there was nothing I could do.

Now till the end,
I'll think of that day,
And in my tears,
I'll float away.
Forever missing you.

(Juhi Farooqui)

*****

Juhi Farooqui
Age 12

Here's in memory of my beloved grandfather, who encouraged me in everything I did, who loved me like only a grandfather can, who was there to support every step I took, and with whom I shared everything. He will forever live on in our hearts.

Loss

What's there to live for in this world?
When everything slips away,
And all we can do is sit and cry,
"Oh why can nothing stay?"
Will any words make any sense,
When all you can do is weep?
For the special one that slipped away,
While you were asleep.
Why can we hold nothing dear?
Everything falls from our hands.
For everything our hearts bring near,
Goes on to a new land.
Do stay with me, oh one I love,
Wait till I am gone,
So that my heart won't break for you,
When your own time comes.

*****

Some angles are already waiting for him at the heaven's front portal.
There would be now ample time for him to go beyond
'Javid Nama' and 'The Waste Land'
He never opted for the easy plum that dropped on his lap.
He always ached for the star that beckoned him beyond the seventh layer of the sky

'Fare thee well, Siraj. The earth feels orphaned after you departure'

* * * * *

(Prof. Shiv K. Kumar is a poet, novelist, short story writer, playwright, critic and translator. He was awarded Padma Bhushan in 2001)

*****

Prof Shiv K. Kumar
Former Professor and Head,
English Dept,
Osmania University

From Ventilator to Morgue

(In Memory of Syed Sirajuddin)

In this cabin from where no body has ever escaped,
Even the air is nosed by the tangled wire
Of a support system that looks like the intestine hooked out
Of a patient on an operation table
There he's gone deep into slumber,
His head tilted towards a blank wall-
As if he is not indifferent to the goings on around him.
He rests after eighty years of voyaging
Through a rugged mountain terrain.
Before walking away, I caress the feet of someone
Who is more mind than body, more spirit than matter.

It is only a few feet from here to the dark chamber
Where he lies huddled up with several others-
Saint or sinner, judge or accused.
He is now nameless, rechristened as only patient number 608.

'Pay up your bills', rattles a voice from the counter,
'Before we can let the body be taken out'

Far away, a patch of sodden earth awaits him,
Under which he will lie till a trumpet calls him to God's presence.

journeys across the elemental stage, and we get caught in the ever flowing current of time, winding back and forth, gathering to itself – in terms of history – all the present, past and future centuries. It is a stark landscape with only a few colours in it, the blue of the sky, the brown of the earth, the glittering silver of snow and rivers under light, the white of light and the black of darkness with an occasional warm red of a lake of blood. Even the green of trees shows itself fitfully. A look at the landscape of the Payam-mashriq will show how Iqbal keeps the romantic and the picturesque out of the canvas of the Javid Nameh.

The Javid Nameh, the Commedia and Paradise Lost all place their stage and their dramatis personae beyond the earth, but the earth sweeps back into all three both temporally and spatially.

* * *

Read at the International Seminar on Iqbal
15-18 February 1987
Department of Persian, Aligarh Muslim University

*****

replies, "I was once a man. My parents were Lambards, Mantovans. I was born near Mantova and lived in Rome, the contemporary of Augustus." With this detail he at once passes into the solid world of flesh and blood. Rumi, on the other hand, remains a shadowy figure in the Javid Nameh, more a symbol than a living being. Iqbal merely says that his old face had the glow of youth, his lips carried the secret of life on them, and unfading light shrouded his person. A comparison between Milton's Satan and Iqbal's Iblees would yield the same result. When Satan, after his great fall, sets up a council and starts a debate, he recreates the theoretically yet unborn British parliament, he himself a solid debator and orator. Iqbal's Iblees looms vaguely from a fog of smoke.

An interesting instance of how Iqbal spiritualizes his landscape occurs on the 'Falak-e-Utarad'. It is delightful land with noise of rushing water among the hills, but without life. Yet there echoes in it the call to prayer, Allah-o-Akbar. Puzzled, Zindarud asks,
It is the abode of saints.

There is little variety in the landscape of the Javid Nameh. Its recurring features are made up of desert and valley, rivers, mountains, the sky, sun, moon and stars, light and darkness. Iqbal varies it only slightly from one celestial region to another. He is not interested in it per se. His cosmology is not elaborate like that of Milton or Dante. He makes use of the Islamic concept of the seven heavens in creating seven celestial stages of his spiritual journey with a glance at the tradition of the 'Miraj' and leaves it at that. He merely needs a device that can enable him to meet the great dead and hear their comments on life and its problems as he saw them. There is no room in the universe he creates from minute or picturesque detail. We accompany Zindarud, as he

Nameh almost always acquires an inner dimensions, or, viewed from the other end, takes on the character of an exteriorization of states of mind or spiritual experience. Let me take one example for illustration. On the first leg of his journey, Zindarud lands on the moon, the abode of the yogi and sage Vishwamitra. The moon's barren hills are soundless. There is no grass here, no birds. The clouds bear no water. This desolate world is a reflection of the ascetic life as it appears from the outside, colourless, dry, unproductive. Rumi tells Zindarud that the inside of this apparently barren world is more agreeable. The two walk through a dark cavern to emerge into a valley where there are tall trees, the air is exhilarating, and, though there is no sun, a soft morning light, overspreads the scene. Even the shadows in this delightful valley have the glow of light.

This is the inner world of the yogi or arif externalized (Jahan Dost – Arif-e-Hindi (Vishwa Mitra)).

This almost constantly implied correspondence between the physical world and the world of ideas or spirit gives a generalized character to the natural scene in the Javid Nameh. They lack the solidity and the mass that similar scenes have in Paradise Lost and the Commedia. This is partly because the last two are epics, which the Javid Nameh, despite its close resemblance with specially the Divine Comedy, is not. It can be classified as a philosophical poem, not an epic. Its characters are not solid enough, its drama not intense enough. Perhaps this needs to be made a little more clear. Virgil in the Commedia and Rumi in the Javid Nameh are identical figures in some ways. Both are 'murshids', or guides. Both appear to the poets from behind a hill. When Dante sees the apparition of Virgil he does not know what he is, man or shade (uomo od ombra). To his query Virgil

reach a better appreciation of each of them, I would like to begin at this point.

The Javid Nameh, like the Mathnavi of Maulana Rum, can be called an Islamic poem. But it is not Islamic in the sense that the Divine Comedy and Paradise Lost are Christian. It draws heavily on the Quran, Islamic ethics and classical Islamic thought, but it does not attract theology as do the other two poems. Compare, for example, the opening of these three. Milton begins with the Biblical version of the fall, Dante with a typical Christian metaphor, often employed in theological discourses, the journey, the loss of the right path, the forest of doubt and sin. The 'Munajat'[3] with which Iqbal introduces his poem speaks of the isolation of man in a non-sentient physical world. The scene here consists of elemental objects, the sky, sun and the moon, the sea the mountains and the wilderness, all of which are mute and dumb to man. There are interminable spaces around us. Placed in this lonely landscape the protagonist yearns for a kindred soul and for knowledge, and revelation. Iqbal is concerned not with religion but with religious experience, the situation that leads to a desire for religious awareness. The milieu that he creates is mystic and has no theological aspect.

In sketching the landscape of the six planets that Zindarud visits in his journey across the heavens, Iqbal uses broad strokes and a large brush. The rich and vivid detail that we find specially in Dante is absent. Both Milton and Dante get so absorbed in the scenes they create that the scenes acquire a life of their own and begin to exist in their own right. Iqbal makes his landscape subserve his theme and its immediate needs, and he does so with economy. He uses it to create an atmosphere which reciprocates his ideas and his concerns. For this reason the natural landscape in the Javid

Prof.S.Sirajuddin

Landscape in Javidnameh

Landscape in a poem, specially a long one, is the spatial arrangement that a poet makes for the unfolding of the drama of his poem. A major poem, apart from other things, is a unique handling of time and space. Poets are conscious of the fact that things have meaning in their spatial and temporal context. Even when they wish to transcend time and space, as Iqbal does so often, they know, through poetic instinct, that they cannot create anything outside time and space, whatever the degree of abstraction they choose. As Picasso put it : "There is no abstract art. One always has to begin with something." Even when the mise-en-scene is extral terrestrial, terrestrial images must people the stage. The earth haunts the celestial.

Iqbal, despite his transcendental aspirations, is constantly preoccupied with zaman and makan. His handling and concept of time has been much written on, his handling of space, the landscape he uses or creates for his abstractions of thought or spiritual states has received much less attention. I propose here to briefly sketch some aspects or features of the material landscape in which the dramatis personae of the Javid Nameh are placed.

Iqbal's Javid Nameh, Dante's Divina Commedia and Milton's Paradise Lost are of a group as poems. In scheme and intention they have strong affinities. At the same time they are as different as any three poems can be. And since I feel that through an understanding of this difference we can

Kalim-Allahi, for Iqbal, is the leadership that defies unjust authority like that of the Pharaoh. It creates a revolution and leads a people to freedom and the joy of self-realisation. One of his qualities is power:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

Asa nahin to kalimi hai kar-i-be-buniyad

Iqbal's preoccupation with power has been mentioned disapprovingly by his Western critics. They think that, by exalting power as he does, Iqbal is moving away from humanist values. This is due to the fact that they do not give enough thought to his concept of power. They think of that element of power as the value that led to fascism in Europe. Iqbal's admiration is for power that is put to the service of mankind.

سروری در دینِ ما خدمت گری ست

Sarwari dar din-i-ma khidmatgarist

It is with this view that he speaks in terms of *hikmat-i-kalimi* and *hikmat-i-fir'awni* in *Pas Cheh Bayad Kard*. Couldn't we say that, when we look at the crises of leadership and the widespread misuse of power in the Third World – or, indeed, any world – Iqbal's concept of exoterically regulated and spiritually controlled power, and normally inspired revolutionary leadership becomes pointedly relevant and meaningful?

(Revised version of a paper read on 17th June, 1988, at a Seminar on Iqbal, at the Iqbal Institute, Srinagar.)

*****

یقین افراد کا سرمایہ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے (طلوعِ اسلام)

Yaqin afrad ka sarmaya-i-ta'mir-i-millat hai
Yahi quwwat hai jo surat-gar-i-taqdir-i-millat hai
(Tulu-i-Islam)

The poetic cornucopia of Iqbal throws up again and again the image of this ideal individual, tough and gentle, independent, considerate, creative, and holding within himself elements of power and humility. Iqbal has various terms for him, *Mu'min, qalandar, mujahid*. Iqbal's interest in personality is inexhaustible. *Javid Namah* in one sense is a personality quest, and connected with this in Iqbal's mind is the problem of leadership. Individuals alone are capable of giving society a lead in the march of evolution. Without leadership society would be left groping on its onward journey.

منزل راہ رواں دور بھی دشوار بھی ہے — کوئی اس قافلے میں قافلہ سالار بھی ہے
بڑھ کہ خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن — اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے

Manzil-i-rah ravan dur bhi dushwar bhi hai
Koi is qafile mein, qafila salar bhi hai
Badh ke khaibar se hai yeh ma'rikah-i-din-o-watan
Is Zamane men koi Haidar-i-karrar bhi hai

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم الٰہی

Nazar ai na mujhe qafila salaron men
Who shabani ke hai tamhid-i-kalim-Allahi

a fresh look at "that body of juristic principles which is called the *Shari'ah*." Despite the great reverence in which Indian Muslims hold him, they have not paid much attention to Iqbal's plea for renovation and change.

We can see that Iqbal is significant in both specific and general ways. In fact, although he was too genuine a thinker and man to keep himself away from immediate political and social issues, his mind was more in its element when concerned with larger truths and the basic motives of human conduct. The *mathnavi*, *Pas Cheh Bayad Kard Ai Aqwam-i-Sharq*, by its title appears to be a work offering a programme of action to the countries of East, but what we actually find in it are general principles of life and human conduct with Iqbal's usual emphasis on the spiritual and ethical element in human affairs. Creativity is once again projected a great spiritual and social value. The East should free its thought from the influence of the West (*Farang*), adopt *hikmat-i-kalimi* (prophetic wisdom) which is informed with truth, earnestness, compassion and humility (*sidq-o-ikhlas-o-niyaz-o-soz-o-dard*) صدق واخلاص ونیاز وسوز ودرد and then reshape the world and its society according to its own norms (*bar murad-i-khud jahan ta mir kun*) برمراد خود جہاں تامیر کن Imitation, or *taqlid*, he condemns.

وائے قومے کشتہ تقلید غیر

wa'i qawme kushtah-i-taqlid-i-ghair (Alas and oh the nation died by aping).

Concerned as Iqbal is with a political and social order that is ethically based and just, he is even more deeply concerned with the basic unit of such an order, the individual. It is the force and make up of the individual that lies at the core of such organisations:

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

Bharosa kar nahin sakte ghulamon ki basirat par
Ke dunya men faqat mardan-i-hur ki ankh hai bina

آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

(Ah mahkumi wa taqleed - o-zawal-e-tahqheeqh)
Alas and oh the slavery, the conformism, and the decline of the spirit of enquiry

Iqbal's call to draw on one's own cultural and spiritual resources, which he expressed by saying: "The vitality of a people is centered in their inner spiritual impulsion's"

امتاں را زندگی جذب دروں *(Ummatan ra zindagi jadhab-i-darun [Pas Cheh Bayad Kard])* and his whish that the spirit of the East spring up again in its body روحِ مشرق اندر تنش باید دمید *(Ruh-i-mashriq andar tanash bayad damid)* assumes meaning in the context of the revolution in Iran, which Iqbal might have watched with close interest were he alive today.

As I stated above, Iqbal's political and social views stem from the general principles of life he discovered for himself through his study of Islam and the Quran in the light of the development of thought in the West. Iqbal does not offer us a philosophical system, but he arrives at certain philosophical positions, and formulates certain values which were not only meaningful in his own time, but continue to be so today. One of the basic concepts of Iqbal is that of change or movement. Islam, according to him, has a built-in view. 1904, in an article published in the *Makhzan*, Iqbal called for

Shahid and Syed Ahmad Khan to Iqbal. Placed thus, Iqbal's deep roots in tradition, as well as his originality, become manifest. It should also be noted that, of the figures mentioned, Iqbal alone is a poet by birth, the only man who has been able to give impassioned poetic form to concepts and ideals that have not often been regarded as ideal material for poetry, and to reflect a vast culture with all its ebb and flow, its tensions, problems and glories.

While Iqbal lived, India and the countries of what is now being called the Third World were still under colonial rule. Political freedom was then, perhaps, uppermost in the minds of the colonial peoples. Iqbal gave new substance to the concept of freedom by placing it on a philosophical level and making it not merely a political and social but also a moral and spiritual need. Slavery was for him the complete negation of all growth, intellectual and moral, an impoverishment of men's minds and lives. "The mind of the enslaved," said Iqbal, "thinks as the master does" (*ba'kam-i-khwajah andishad ghulam)*

The Third World is now politically free, but in several ways its subservience is not yet over. Iqbal would have thought that his phrase *ba kam-i-khwajah andishad ghulam* (بکام خواجہ اندیشہ غلام) would still apply to the people of the Third World, for Iqbal saw slavery in more senses than the political. Mental slavery killed the highest function of the human self, creativity, and renderd the eye incapable of insight:

him in a position few poets have enjoyed either in the subcontinent or elsewhere. Almost sixty years after his death, he is still regarded by the generality of Muslims as their preceptor and guide. In matters of conduct and belief they seek his guidance. He has given them phrases or lines that memorably sum up personalities and systems, *Payghambar-i-Haqq na Shanas* (godless prophet) *Majdhub-i-Farangi* (The Ecstatic European), two terms he used to describe Neitzche, and *masavat-i-shikam* (equality of livelihood) by which he referred to socialism. Often, such phrases or lines direct and crystallize their own responses to men and matters. Despite the attempts of modernist intellectuals to depoliticise Iqbal and treat him primarily as a poet rather than a leader or teacher, the Muslim community has refused to give up their image of him. They not only warm their hands at his fire but seek it out so that it may illuminate a way for them. This doubtless has prevented Iqbal's poetic personality from coming fully to the fore, but it also explains the very specific significance he has had for the average Muslim in India and perhaps, also, in the Islamic Third World. Dr. Schimmel, in *Gabriel's Wing*, has given the episode of a Turkish waiter who wished eagerly to hear from her about the poetry and person of Dr. Mohammad Iqbal.

To understand the significance of Iqbal for Muslims, whether in India or outside, we need to place him in the context of a certain more or less regular socio-religious process in Islamic history. Periodical reinterpretation of Islam with reference to its fundamental sources, and in terms of changing times, has been a more or less regular feature of the Muslim experience. From al-Ghazzali and ibn Taimiyyah to Shah Wali-Allah there is a whole chain of men who attempted this task of reinterpretation. In India, the line from Shah Wali-Allah extends through men like Shah Ismail

the international seminars on the poet in Delhi, Lahore and Hyderabad in 1970 and 1980s.

In India, Iqbal has two aspects, that of the poet of early nationalist, patriotic poetry, the poet of "Sare Jahan se Achchha"and "Himalah", and that of the later Iqbal, the Islamic thinker, the man who realised and incorporated in his imposing, poetic structure, the essence and richness of a world religion and culture. The early, romantic Iqbal seems likely to remain dear to India generally since he has captured, in his early poems, the emotional atmosphere of an inspiring period in the history of the subcontinent. The haunting charm of his lyrics is reinforced today by a nostalgia for a time when the diverse elements of a huge Indian population had come closer together, closer than they had come before or would come later. However, some of Iqbal's views do acquire significance afresh in the modern Indian context. For example, he had held that only a loose federation with a maximum freedom for the federating units was politically viable in India. "There can be no peace in India," he declared in 1930, in his presidential address to the annual session of the Muslim League, "so long as it is not recognized that every nationality has a right to develop on modern lines without breaking with its past. "This view has been restated in different forms and discussed in the new context of a less centralized India.

For Muslims in India Iqbal has a deeper significance. Indian Muslims appear to have paid greater attention to Iqbal as a thinker than as a poet. This is clear from the titles they gave him, '*Allamah*, *Tarjuman-i-Haqiqat*, *Dana-i-Raz* etc. Iqbal's determination to use poetry as a means of reformation, his feeling for his people, and his desire to reach the masses at a critical moment in their history have placed

legislature). However, he did help to restore the price of the long enslaved East by claiming that the East had something of great value to offer to the West – an ethical basis of life, and a spirituality which could serve to control the West's unbridled hunger for money and power. Iqbal is thus champion of the Third World, although he is mainly concerned with the Islamic part of it. His feeling for the oppressed extends to all, but his preoccupation is with the lands of Islam. From these lands, however, his voice can reach out to the rest of the world.

If we ask the question: what is Iqbal's importance to India and the Third World, certain points would need clarification. First, which India do we mean? With a revival of regional centres of cultural and political activity in the country, the shadow of Iqbal, along with the culture he stood for and the language he wrote in, is shrinking. Though he has emerged as an international figure, especially since the late 1970, his Indian audience has perhaps diminished. There are urban pockets where he still looms large. Two places, in my experience, where Iqbal is still a tangible force with a mass impact are Hyderabad and Srinagar, though in Hyderabad his appeal is limited to the Urdu-speaking section of the public. The Islamic Third World, for whose sake Iqbal wrote his serious poetry in Persian, seems to have awoken to a realization of Iqbal as one of the greatest Islamic Figures, along with Jamaluddin Afghani, of the twentieth century. In this part of the Third World, Iqbal is known predominantly as a reformer, *Muslih-I Qaran-I Akhiri* as Ali Shariati called him. Admiration for Iqbal has grown in Iran, Afghanistan and Trukey, areas, to a greater or lesser degree, of Persian linguistic influence. The Arab world knows less of him, though Egypt has begun to be drawn to him, as was seen in

addressed not to other philosophers and poets, but to a group of society of people which has a permanent creed and an already determined mode of conduct. Such a society, he thinks, is the *Ummah* of Islam, and, since the ideals he has before him, though meant for mankind in general, can be effectively realized only through such a society, he has perforce to address himself to it. It is this stand of Iqbal's that makes it incumbent on those who wish to reach the universal in him to pass through and understand his Islamic affiliations.

Iqbal's desire to reach and influence society gives his verse a temporal and political aspect. Iqbal's *political* concern is to rid the world of injustice, exploitation and the domination of one group of people over another. This concern is related to the more basic ideas of his philosophy: power, have, the self, the autonomy of the human mind, creativity and *faqr* (which combines power with humility, and independence with submission to Divine Will). Iqbal quite manifestly does not have a definite political or economic programme, he merely provides the basic spiritual and ethical ingredients of such a programme, a programme which might slowly take shape of mankind, understands its destiny, and its relationship with the universe and with the permanence that lies beyond the flux of time and charge.

In Iqbal's time the general term for the "Third World" was "the East," static, inert, inhabited by a subject people, dominated by the dynamic and industrialised West. East and West are treated by Iqbal as two distinct attitudes. He finds both inadequate and disappointing, and sets himself the task of evolving a synthesis. The synthesis, if he does find it, is of the purely theoretical kind, as Iqbal only occasionally suggests an institutional means of accomplishing it (for example, his suggestion of *ijmā* through a democratic

Prof.S.Sirajuddin

A Poet's Significance: Iqbal & The Third World

The significance of a poet lies beyond his immediate concerns and the ostensible topics of his writing. Poetry works through complex means, including, among other things, verbal rhythms which form part of its import. Significance in the case of poetry involves not only understanding but sensation, evoking a response which is part cognitive and part neural. The significance alters with each generation of readers in accordance with their peculiar sensibility and also, perhaps, their needs. Thus, as such to talk of Iqbal's significance in a specific sense is to limit it. In its higher reaches, Iqbal's poetry transcends limited goals and acquires a universal human value. However Iqbal exists not only as a poet, but also as a distinct thinker, distinct sometimes from the poet. There is no conflict between the poet and the thinker, at least no serious conflict, but occasionally one or the other has the stage to himself. In Iqbal's prose, the poet does not interfere with the thinker, in his poetry the thinker does, although, in the best poetry, the distinction between the two disappears or is kept out of view. It is also true that Iqbal addressed himself to a certain group of people whom he regarded as the target of his ideas and whom he sought to sting and motivate into shaping a society which, according to him, Islam envisaged and which Muslims had thus far failed to realise.

Iqbal's desire to make his poetry (and also his prose writings) an instrument of social and political change is obvious. In a letter to Reynold A. Nicholson he speaks of how, if a philosophy is to penetrate human life, it has to be

man in his cosmetic status, sets out on a journey across oceans and mountains, and, beyond the earth, to the moon asking them if they have any affinity with him. They all keep to themselves and say nothing. He finally reaches the presence of God to tell him that the universe has nothing in common with him – *Jehan tehi ze dil o musht-e khak-e mun hama dil* (The universe lacks what I have, a heart). In reply he merely gets a knowing smile.

From the *Bang-e-Dara* and the *Payam-e-Mashriq* two streams flow out. One passes (publication chronology overlooked) through the *Asrar* and the *Rumuz* to reach the *Javeed Namah*, the other runs on to the *Zabur-e-Ajam*. The *Javeed Namah* deals with problems of power, of leadership, probing society and civilization and the human personality. The *Zabur*, as Iqbal himself has said, is poetry to be read in solitude – *Agar ho zauq to khilvat mein parh Zabur-e Ajam*. The *Javed Namah* leans towards reason, the *Zabur* towards intution. In my opinion two streams merge in the best poems and ghazals of the *Bal-e Jibril*, producing some of the finest philosophical poetry found in the Indo-Persian literature. But that is another story the telling of which would need another session.

*****

If I had time and space I would sketch a detailed critical reading of the *Payam* as I have done to an extent, in the case of the *Bang-e-Dara*, but in view of the limitations of a lecture I would content myself with a few general remarks. Of all Iqbal's works the *Payam* is closest to the Bang-e-Dara, thematically and stylistically. It is one of the finest of Iqbal's Persian works and at places touches pure poetry as no other work does. The landscape here is varied and rich, Nature, as poems like "Bu-e-gul", "Surood-e-Anjum", "Lalah', "Kirmak-e-Shabtab" and "Shabnam" testify, is still a joy in itself, and the philosophic strain of some of the poems of the *Bang-e-Dara* gets more strongly defined, for example, in the "Lala-e Tur", and in the poems about the fall of Adam and his arrival on earth, the mystic defiance of Iblis, the song of time and the dialogue between man and God. The tone and the language in the *Payam* are more assured than in the *Bang-e-Dara*. In the section called the "Mai-e-Baqi" Hafiz seems to come alive with a twentieth century consciousness, and Iqbal in the phrasing of the great Persian pleads for ecstasy infused with awareness.

I would like here to call the attention of Iqbal's reader to a particular point about his poetry before I wind up, a point which is often inadvertently missed or ignored, but which is of central importance for a full understanding of Iqbal's *opera poetica*. I refer to the poet's sense of isolation and loneliness which is co-ordinate with the loneliness of man as man – "l'umo che e solo con se" (man who is alone with himself). In the *Bang-e* Dara there is a small poem on this theme entitled "Tanhai" (Loneliness)- *Kis shai ki tujhe havas hai ai dil* ("what is it you miss my heart"). In the *Payam-e-Mashriq* this feeling has acquired cosmic dimensions. In a poem, which has the same title as the one in the *Bang-e-Dara*, the protagonist, which is the poet himself, which is

Vahid's book on the poet. This would obviously mean that Mr. Vahid's presentation is inadequate. I have already referred to Iqbal's gentleness and his closeness to the child. Let me now refer to his poem on the death of his mother (see *Bang-e-Dara* p. 255).

Any one who reads the poem and its moving lines will have little doubt about Iqbal's humanitarian quality. What Forster is looking for is compassion. The equivalent of compassion in Urdu-Persian tradition is *dard*, a term which is even deeper and more comprehensive than compassion. And if Iqbal is not a poet of *dard*, he is not a poet at all. For lack of it paradise itself is a dead world to him. Forster naturally could have no notion as to how Iqbal's power leads to gentleness and compassion. It is the coming together of power and compassion that Iqbal saw in perfection in the person of the Prophet of Islam, a fusion which made the Prophet, as the Persian poet, Jami, put it, both "Ṣhah-e-shahan" and "Shah-e-gadayan", i.e. alike the King of kings and King of the poor.

With the "Khizr-e-Rah" Iqbal's poetry reaches a take off point. His thought deepens and takes over the direction of his poetry. Iqbal uses the myth of Khizr to probe the life of man on earth. Like Tiresias in Eliot's "Waste Land", the deathless Khizr provides flashes of universal and prophetic insights into life and society. There is no room here for a detailed analysis of this poem, but it gives clear indications of the philosophic poet feeling his way forward with steady steps. Iqbal's crucial idea of life as a constant and progressive movement, his strong dislike of exploitation, imperialism and the capitalist order all receive their early definition in this poem.

When we move on to the third and last section of the *Bang-e-Dara* which opens with the "Balad-e-Islamyah" and reaches a climax in the "Shikvah", we find ourselves in a changed ambience. The change is not really sudden, we had indications of it in earlier poems like "Bilal,", "Abdul Qader Ke Nam" and "Saqliyah" but it certainly seems quite pronounced. If we read, for example, the poem on "The Poet and the Candle" – the candle has appeared thrice earlier in the first section – we can sense the difference. Iqbal's rhetoric is at its most powerful in those poems in this section which made him famous throughout Muslim India. Poetically the third section has appeared to me as a kind of hyphen between Iqbal's early romantic poetry and his later philosophical verse. It is in this section that historic time assumes such importance for Iqbal. Great as the "Shikvah" is, I tend to regard it as a pause in Iqbal's onward journey. But the third part of *Bang-e-Dara* is not all of a piece, there are poems in it in which the poet of the first part comes alive, e.g. in "Chand" and "Shaer" (p. 187 and p. 235), and others in which the poet to come is being born, e.g. the "Khizr-e-Rah" and the "Irteqa" (pp. 288, 249). Before we take a look at the 'Khizr-e-Rah', there is one more very significant poem of Iqbal is this section which we should note, his poem on the death of his mother, one of the finest and one of the best constructed of his poems. E. M. Forster once called Iqbal 'anti-humanitarian'. In a letter (quoted in Dr. Rafiq Zaaria's foreword to Mr. Khushwant Sing's English version of the "Shikvah" and the "Javab") he once wrote "Humanitarian has two senses : (i) development of human powers and (ii) compassion and responsibility felt by the strong for the weak's failures. Iqbal (as far as I can gather from Vahid's book and it is almost my only authority) was humanitarian in sense (i) but not in sense (ii)". Forster's only source of knowing Iqbal, according to his own assertion is Mr. S. A.

Wordsworth, who seems to be active influence at this time, he does not move towards pantheism. Nature can unlock sources of wonder and joy in man, it can stimulate his questioning soul but it does not admit of apotheosis for him. Revelation, which is the highest event for man, comes through other sources. In the "Aftab-e Subh", addressing the sun and let us remember that as an image and symbol the sun continues to shine in Iqbal's poetry to the end – Iqbal writes that while the sun opens out the world to the eye it needs a different vision for the inner eye to open (p. 37).

Iqbal finds the beauty of natural objects fascinating but static, and contrasts it with the restless, dynamic sensibility of man. As an example one can refer to lines 1,3,9,10 and 11 in the "Gul-e Rangin" (pp. 6,8).

There is a small group of minor poems in the second part of the *Bang-e Dara* which should not be skipped.. These are poems in which Iqbal speaks of his love in the romantic sense, the love for a woman (ishq-e-majazi). To modern taste these poems might appear too mild, but there are glimpses in them of a passion sophisticated by a deep culture and manners. Only a lover could write lines like those in the poem entitled "Visal" (Union) where the poet speaks of how it is the imprisonment of love that has liberated him (pp. 126,27).

. These poems are particularly educative for those readers of Iqbal who never allow him to get off a pedestal if not the pulpit. Further the love song in Iqbal's later poetry is going to change so much in tone and tenor that it is time we paused here and relished it.

Van bhi insan hai qateel-e zauq-e istefham kya.

Even while fascinated, the poet's eye is searching for a secret at the core of things, what in Urdu-Persian literary tradition has been termed *raz-e daroon-e Khana*. In several poems of the *Bang-e Dara*, as in English romantic poetry, man develops a close relationship with Nature, and yet there is something in man that keeps him apart, the aching heart in his breast is what Nature lacks (p. 77):

Dard jis pehlu mein utthta hai woh pehlu aur hai.

And this separateness in not, as in Keats's "Nightingale", the result of a waking up to reality but an awareness of an evolutionary difference. In the poem on the candle (Shama) the poet and the candle have the same identity – I too burn and suffer like you (i.e. the candle) – but as the poem proceeds the significant difference between the two emerges which consists in the awareness of the 'burning' which is peculiar to man (pp. 32,33).

Iqbal does not rue this human sensibility, the capacity to suffer and have awareness of one's suffering; he does not cry out in despair "adieu, adieu" when the moment of communion with nature is past and the consciousness of the self returns. On the contrary he regards this consciousness as a seminal, germinal force, seen at its best in man but operative even in the inanimate world, giving every object its special identity (p. 33).

In poems like "Himala", "Abr-e-Kohsar", "Ek Arzoo" etc. Iqbal is an entranced spectator. Nature unveils its beauties before his fascinated eye, and, as he watches, he is not troubled by any intrusive thoughts. But unlike

"Childhood" (*Ahd-e-Tifli*), p. 8, vv. 1,3,4,5. In these verses Iqbal speaks with deep tenderness about the child's absorption in watching a candle flame, in watching the moon pacing through tattered clouds, the rapt childish interest in the fictitious stories about the moon, even in the clanging of the door chain meant to divert his/her attention. There is a remarkable freshness in the poems of the first part of the *Bang-e-Dara*. The diction is an advance on Hali – outside the Musaddas - and Mohammad Husain Azad, the two major writers who gave a new tone to Urdu poetry. Iqbal's mind is still free from the serious preoccupations of his later period. With an unburdened eye the poet views the beauty that manifests itself in Nature and its varied forms. "Himala", "Gul-e-Rangin", "Abr-e-Kohsar", "Shama", "Aftab", "Tifl-e-Shirkhwar", "Jugnu" are poems in which a lively scene of wonder has surfaced, mixed with a carefree response to beauty, e.g. in the "Gul-e-Rangin" where he addresses the rose to say that he watches it with the bulbul's (lover's) eye, unconcerned with intrusive philosophic consideration (*Bang-e-Dara*. P.6)

Kam mujh ko deeda-e hikmat ke uljheron se kya
Deeda-e bulbul se main karta hun nazzara tera.

Those poems in the first section of the Bang-e-Dara call for particular attention where a tension develops between a sense of wo- der and a persistent questioning of the mind, e.g. in the "Moth and the Candle" (p. 27) : Why does the moth love the candle so much? Does it find solace in burning itself to death? Does it find eternal life in the candle's flame? In another poem, "Khuftagan-e Khak se Istefsar" he wants to know from the dead if man is a victim of restless questioning in the other world too (p. 26):

lies the real adventure of reading him, the joy of experiencing a pilgrimage in which, as Iqbal has himself put in a different context, it is the moving on that exhilarates (*Masti-e-ma khiram-e ma*).

The starting point for this journey I consider to be the *Bang-e-Dara* (1924). This book was published long after the *Asrar* (1915) and the *Rumuz* (1918) and even after the *Payam-e-Mashriq* (1923), but most of its poems belong to a much earlier period. The poems of its first two sections, for example, were written between 1900 and 1908. anyone who has read the *Bang-e-Dara* in early days or heard its poems in childhood is never likely to agree with that picture of the poet in which he is represented as an austere thinker concerned with deeply philosophic ideas, or a writer with a flair for sermonizing, or, as some people still think, a mere orthodox Muslim preaching his creed to the world. For my part, I had the luck to listen to some of Iqbal's early poems, when a small child, from my mother who read them out in her soft and musical voice with great feeling. Because of this perhaps when I find people using titles like *Allama Iqbal*, or *Shair-e-Mashriq* or *Tarjuman-e-Haqeeqat* for the poet, the child in me protests and cannot understand why such heavy phrases are being used for a man who had written "The Plaint of a Bird", and "The Glow-worm", and "A Child's Prayer". This, with your leave, is a bit of autobiography but what I am trying to drive at is the fact that, among other things. Iqbal is a friend of the child, that he gentle in the sense in which poets like Wordsworth and Blake were gentle. His poems for children apart, there are several pieces in which he has caught the endearments of childhood and the tremors of a child's heart. I would like here to refer to the following poems: "The Lamp and the Child" (*Bachcha aur Shama*), pp. 94, 95 verses 1,9,11; "The Infant" (*Tifl-e-Shirkhwar*), p. 60, vv 1,2;

Islamic history. To such a reader who has not had the time to think of any particular approach to Iqbal's poetry, I wish to address a few suggestions.

Iqbal's poetry can be viewed within several orbits, within the orbit of the Islamic faith, of Indo-Islamic thought of the Indian political struggle of pre-independence days, of stylistics, of the Indian Renaissance which began with Ram Mohan Roy, of the Islamic Renaissance which began with Jamaluddin Afghani, of the Urdu and Persian literary development in India, of that Islamic thought and culture of which the boundaries extend from Hijaz and Egypt to Iran, Afghanistan and India and which embrace such men as Ibn-al-Arabi, Imam Al Ghazzali, Imam Ibn-e-Taimya, Shah Waliullah, Al Jeeli, Jamaluddin Afghani, Jalaluddin Rumi, Khwaja Hafiz, Mirza Bedil, Mirza Ghalib and Iqbal himself. From one orbit to another the movement and curve of Iqbal's poetry would vary. But we are not concerned here with a channelized study of Iqbal, we are concerned with that aesthetic and cognitive verbal complex *per se* which we call *Kalam-e-Iqbal*, with the object of acquiring some kind of ordered and balanced response to the complex. This response, even on the part of Iqbal's admirers, has been largely partial or heavily weighted in favour of a premise. Rarely do we come across a reader or a critic who allows Iqbal's poetry to sink in his mind and then grow and expand in those various directions that sometimes appear contradictory to minds unfamiliar with the characteristic waywardness of a truly poetic sensibility. The point to note is that the poetry of Iqbal is not a static structure but a moving spiral, the journeying of a soul across nature and the human landscape. If the journey envisages an ultimate goal it does not follow that the mind of the poet has always been in a state of having arrived. In accompanying the poet on this journey

semantics, philosophy, the opinions or views of other people and of established scholars.

This preamble is meant to indicate the complexity of the experience which the reading of a poet, specially a complex poet, is. When suggesting an approach to the reading of a poet, by which I mean roughly a reading scheme, the question that has to be dealt with before proceeding further is what kind of reader is presently envisaged. Basically this reader is myself. I am concerned initially at least, and vitally, with my own experience of Iqbal's poetry, and let me state right at the start that it has been an experience that spans my entire life. Over this long period contact with Iqbal's poetry has never been constant, nor has the approach to it been scholarly or, most of the time, even critical. It has been the approach of an average man of culture with some knowledge of history, some acquaintance with a few languages and with poetry written in them, a rough awareness of trends in the modern world, and a sensibility for poetry somewhat refined and catholicized over the years. However, I have no wish to make this lecture a piece of autobiography, for autobiography in such a context can only be of marginal interest, if not exasperating to the well informed reader. I wish only to use my experience as the core of the approach that I suggest, because that experience is more reliable than any other and it alone can give some touch of authenticity to what I am going to say.

Let me imagine, then, a reader of Iqbal who is roughly equipped like me, may be a little more or a little less. It is an Indian reader with a fair knowledge Urdu and its literature, a fairish knowledge of English, some acquaintance with Persian language and literature, and an awareness of the history of the Indian sub-continent and of the highlights of

it cannot explain or even appreciate fully a creative act, nor can it totally analyse a reader's response to a work of art. When men and women read (or recite aloud to themselves) lines of a poem, it is not merely their linguistic and semantic consciousness which is at work, much besides is involved, for example, their sense of time and space, their awareness of the contemporary world and of past history, their consciousness of the moment in which the reading is taking place, their entire background, their entire life *vis a vis* the world that the poet confronts them with. I therefore like to maintain that a fair amount of subjectivity is implied in all reading and understanding of poetry, in fact even in all scholarly or philosophical criticism. T. S. Eliot, for example, in his conversation lecture at the University of Leeds, 1961 published under the title "To Criticise the Critic", admits that concepts like the 'dissociation of sensibility' and 'objective correlative' ("Hamlet and his Problems"), concepts which apparently seemed the result of an objective study, were caused by his "reaction against the poetry...of the nineteenth and early twentieth centuries" coupled with his "passion for the poetry... of the late sixteenth and early seventeenths centuries" and his "bias towards the more mature plays of Shakespeare". He calls these phrases "conceptual symbols for emotional preference". "it seems to me in fact", he states, "that these concepts, these generalizations had their origin in my sensibility". (pp. 19, 20) This would imply that as a reader he was applying his own sensibility to the work of the poets whom he studied.

Let us say that when we read a poet we try subconsciously to fuse subjective elements with objectivism we have learnt from empirical science, our knowledge of human history, of other arts, other languages, linguistics,

Prof.S.Sirajuddin

An Approach to the Reading of Iqbal's Poetry

There exists a delicate, tenuous relationship between reader and poet. In one sense all criticism outside Ph.D. theses is an exploration of this relationship. Whatever might be said in favour of objectivity what is involved in all reading is the interaction of two minds, one in a communicative or at least exteriorizing mood and the other in a receptive or apprehensive mood. Criticism at one stage was eager to discover the intention of the writer, to find out what he really meant. For this it would have recourse to the personality and life of the writer. But it was later found that this could be a frustrating quest. Apart from the fact that it is so difficult to analyse motives and moods, there is the further difficulty of the medium of expression. If nothing else language itself which is supposed to hold a mirror to intention stands out as a barrier, as modern linguistics and semantics have shown and as the poet Ghalib put it; "When all veils are torn off there remains the obstacle of the seeing eye."

With the development of linguistics the idea has grown of reading literature as a verbal structure. "Every work of literature", says a recent critic, "...is a specialized language-act (what the latest school of criticism in France call *ecriture*)." "Certain lexical and syntactical material", he continues, "is filled out according to principles other than those of basic communication." George Steiner here is concerned with "interactions between semantics units"

This attitude with its emphasis on *explication de text* has served a useful purpose in as much as it has brought greater precision to criticism and to the reading of poetry, but

It took me some time to digest the news of my parents' condition. Both were in the hospital at the same time. In speaking with my cousins and Aunt, it did not seem too serious at first. They were told that it was perhaps a viral infection which was spreading all over Hyderabad, through mosquitos. But when I was told that my father's condition was deteriorating, I immediately decided to leave for Hyderabad. By the time I landed my father had been put on the ventilator, my mother was getting better. The viral infection had spread into his lungs and was affecting his breathing. He was frail and weak. They told me he had not opened his eyes all day. They told me to be prepared to see him thus. I walked into the ICU and approached his bed. He opened his eyes and looked at me. He wanted to say something, but the ventilator would not allow it. I started to talk to him. For a short time I did. A tear rolled down his eyes. Then it was time to give him his sedatives. He went back to sleep. He woke up again and asked for me with his eyes. I went back and talked to him for a few more minutes. He could not talk back. They gave him the sedatives. He went back to sleep. He never woke up again.

Brief Introduction:
Jafer Ehtesham (Syed Jafer Ehteshamuddin), son of Late Professor Syed Sirajuddin, lives in the USA, near Sacramento, California, with his wife and seven year old son. He works as Program Manager at Verifone, INC. He studied Engineering in Hyderabad.

*****

had thought that she was not up to such a long walk on a hot day. We started walking back in the direction we had come.

The April-May sun was high up in the sky and beating upon us. From a small distance, I could see the Siva Reddy Pet guest house up on the other hill. I felt very tired and thirsty. My throat was parched. My legs hurt as I pushed forward each step. I kept repeating to my father that I was too thirsty, that I needed water. But there was no water around. "We do not have too far to go," he kept saying encouragingly. "We can even see the Bangalow from here." It was hard for him to see me in a hardship. Especially the one in which I was depending on him and there was not much he could do. I could feel that he felt helpless. And his tender heart ached to see me struggle through the remainder of our trip. The last mile was quite a difficult one for me. It was for him too, as the day had turned hot and we did not have access to water. But my father was quite used to walking. He walked almost everyday, even up to the time of his last illness. And his walk was sprightly and brisk. Always. It was hard to keep up with him, even now, when he was past eighty years old. Back then he was younger, I was little. With him by me, I was never anxious. It never occurred to me that I might not make it back to the guest house. And just then, we saw a familiar sight- my mother anxiously looking out of the window.

I was in Bangkok, Thailand, on a business visit, when my mobile phone rang. It was a call from my wife Farhana, in the US. She gave me the news that both my mother and my father were in the hospital. What happened? Did they contract a virus at the same time? Was it in something they ate? How are they? Are they being treated properly? Is it serious? Should I fly over to Hyderabad?

observed him making light conversation with friends and acquaintances. Such was the charm of his personality that he immediately got popular in any group, even with younger people, my friends. After a while, my friends would only be talking with him, enjoying his humor, listening to his witty anecdotes, asking him questions and ignoring me altogether. It is obvious that he was quite popular among old and young alike.

My father was awarded a lot of respect from everyone. His respect was earned through personality, not acquired through any position of power. People respected him for his intellect, his knowledge, his character, his compassion, his honesty, his integrity, his warm heartedness and his innocence. It was due to his wonderful nature. And it perhaps was due the same wonderful nature that he made and kept friends for a lifetime. Friendships were an important part of my father's life. At times, when he spoke about some that had departed, his eyes would tear up and I could tell how much feeling he had for them. We grew up knowing his closest friends, whose names became household names for us.

It was late morning, after walking around in the somewhat tended gardens of the old house, it was time for us to leave. "Mama might start getting worried," said my father, repeating the expression that I had heard many a time before and would hear many, many times after. He worried about making my mother anxious, who suffers from an anxiety disorder. And every time he would be gone for a while, even a few hours, he would make a mention of my mother, who would, almost always, be at home, if not, on occasion, with us. And this time, we had not brought my sister with us either. She is a year younger than I and perhaps my father

inches deep, with their droppings. I could never tell what kind of flooring it was, there was not even a small patch exposed.

My father joined me peering into the big room of the neglected empty house. It had no furniture. We then walked along the side, opened another door and peeped into another room. It was a similar sight. Bats occupied the entire house, but from the outside, it still looked grand, haplessly protecting its history from prevalent decay of most things from the past Hyderabad. My father experienced, lived through and lamented this decay. Being from the golden era of "Old Hyderabad", my father saw how everything around him had changed. And often, he would pose the question, perhaps to himself, as to others, "Is this change really for the good?" In discussion he would mention what he thought of, in his words, "so-called progress". He believed that all (modern) progress had its drawbacks. With industry came ugly chimneys and toxic effluents, with automobiles, traffic and pollution, with the typewriter (or computer) the loss of personality in handwriting. But at the same time, he was not stagnant or adverse to all change. He accepted and quickly adapted. However, he had the astuteness of looking at things in ways others could not. For example, his in depth understanding of "Globalization" was impressive. He could argue at length on why it was bad, with examples, and needless to say, he was mostly against it.

Not being a writer, or a scholar myself, I still admired my father. Despite the intellectual that he was, he had the gift of conversation in any company. I observed him in some of his speeches and lectures, where he spoke about his subject, about "Iqbaliat", about Urdu literature, about poetry, revealing his deep study and vast knowledge, just as I also

sizeable chunk of the wall itself, exposing once interior bricks that appeared like fresh, open wounds left to heal by themselves. The elaborate wooden windows and doors were closed. It did not seem like anyone lived inside. But in sorry decline too the house stood strident and tall, exuding its lonely magnificence on a beautiful man and his curious child.

We walked up to the Western terrace of the house that looked out onto the steeper, foresty hills of Anand Giri. From here, the view was even more beautiful. Whoever had designed the house new exactly which way to look out towards. Being tired from the long walk, my father and I sat down on this terrace to rest, looking out at the surrounding beauty. After a little while, with a half smile on his face, a haze in his eyes, he stretched his legs, lit his cigar... "Wah"!

Curious, excited, courageous with him by my side, with him looking after me, protecting me from danger, explaining to me, silently teaching me about enjoyment, about feeling, I walked towards the house and pushed hard on the main door of the house that led to the terrace we were on. It creaked and then seemed to move, creaked again and moved again. I pushed harder and with a deeper creak, the huge wooden door opened up half way. I could see what was inside. It was a huge room with very high ceilings, with glass paned light-vents towards the top, making the room bright- bright enough to see what was in there, above and below, and when I saw, I almost shrieked. Shivers ran down my spine. I hoped my father was close enough. The large room was full of bats. There were thousands of them, hundreds of thousands perhaps, hanging from the beams of the ceiling, from every possible place on the ceiling, squeaking, sleeping, fighting, flying about, but mostly docile in the bright light streaming in through the light-vents. I had never seen so many bats before. The entire floor of the large room was covered, two or three

separated from him, it is only now that I feel the damp loneliness of being fatherless; while during every part of the past seventeen years, I always did have the shelter of his protection, the comfort of his presence, albeit on the other side of the world, the relaxing permanence of his love.

Holding my hand, my father led me downhill that morning. He had unusually soft and gentle hands. Like, somehow they were an extension of his soft and gentle soul. Any person who shook hands with him might have noticed how supple and spongy his hand was. And with my little hand in his I felt comfortable, sheltered, protected and safe, eager to walk with him, through the mellow wilderness, to Mehboob Cottage. The walk went on for a few hours, as it turned out, the hill with the house was futher than it appeared. At certain points on the way, the bushes got closer and thicker and had to be parted to make way for us, to keep our skin from getting bruised. Eventually, the deep red soil got exposed in bigger patches until we reached a clearing below the hill with the house. And there for the first time, I saw a real Gypsy dwelling- a temporary village of the quaint Lambadas. Men in dhotis and women in mirrored red dresses. They had their loyal dogs with them and bullock carts, some of which had utensils, kambals and other household items. Perhaps I kept asking my father a lot of questions about them, for I have been intrigued by the Lamadas ever since and sometimes have wondered if I now resemble them in some way, having left the permanence of Hyderabad and being on the move since. We kept walking past the noisy assemblage, up the gentle slope, to the huge, spectacular house that stood at the top.

Sun shone brightly on the dark moss covered, helpless walls of beautiful Mehboob Cottage. There were irregular patches where the plaster had fallen off, taking with it, in places, a

its Cambridge past. For me however, the high standard in literature was not as difficult because I could get help from my father. He would get irritated at me trying to cram for exams, with not much time left and would question as to why I could not have done it earlier. Grudgingly and irritably, he would then spend hours with me, helping me to prepare and do well at my tests. And through it all, I could see how eager he was that I did well, at exams, at school, in life. I could feel how much he loved me.

And yet, that morning, on the edge of the hill, my father might have just been enjoying the moment. I saw him standing there, with a half smile on his face, a deep haze in his eyes, while he looked on. Joy would come to him from within. He had the incredible knack of enjoying an occasion to the fullest. He knew how to "live the moment". On a picnic, he would locate himself in a good spot, feel the gentle breeze, stretch his feet, light a cigar and utter, from his stomach, "Wah..." The word and style of utterance are engrained in my psyche. For it was not an ordinary utterance. This word, coming from my father, was laden, with an acute awareness of Culture, History, Literature, Poetry, Art, Compassion and Love. All combined, to resonate the simple expression with a profound, weighty, deep, resounding, tone. When I think of him now, I can only think of him with his joyous smile, his blissful expression and his openly loving eyes. After I left Hyderabad, I would only encounter my father in phone conversations and during occasional visits, when he came to visit me in the United States, or when I went to visit Hyderabad. These meetings were short and marred with other activities, taking away from me spending much time with him. How I regret this now. How I wish I had the opportunity to be with him some more, experience him some more, learn from him, admire him. But then, although it has been seventeen years while I was away and

world of a painter? He might have been painting in his mind, his next watercolor. I have his small collection now, comprised of seven or eight paintings, most of which are landscapes. My favorite is that of a Qutub Shahi Mosque, in ruins, at sunset, missing a minaret, sad in decay. It is expressive, intricate, symbolic and beautiful. A metaphor for Old Hyderabad at dusk? I can only guess. My Father never explained his paintings.

Or, while he stood that morning on the edge of the hill, he might have been in yet another world- the world of poetry. He might have been writing his next poem. Or perhaps reciting one by Iqbal, or Ghalib, or Mir, or Faiz. Alas, how I wish I had studied Urdu. My father often told me that without Urdu poetry, I was missing out on quite a bit. For that is how he viewed Urdu poetry, as a significant contribution to the "sensitivity" of Mankind, to the sophistication of emotional depiction and to the high caliber of the expression of Love. With his insight, his study and his everyday enjoyment of Urdu poetry, I can only repeat and believe his words. Yet, at that time on the hill, my father might have been reciting a verse by Wordsworth, or Shelley, or Goldsmith, or Keats. For he had high knowledge and regard for English poetry too. As Professor of English at Osmania University, my father was nicknamed "Shakespeare" among some students. Apart from him being a writer, poet and scholar of the English language, the nickname may have also been due to the fact that his "baldness" resembled Shakespeare's, in potraits.

I remember the times when my father had to help me prepare for my high school examinations. I had to study Shakespeare, Hardy, Shaw and several other English writers for what, in the past, used to be Junior and Senior Cambridge Certificates. These were "nationalized" into ICSE and ISC, however, the English language syllabus was obviously not changed from

location away from the now familiar surroundings of the guest house. Is it not amazing how we get comfortable with surroundings we have known for but a few days, while we are in a completely new environment. Immediately, a guest house, a hotel or a relative's house, in unfamiliar terrain becomes "home". And getting back to it provides us with the coziness of relative familiarity.

I was, perhaps, eight or nine years old then. My Father was taking me to Mehboob Cottage.

The walk got etched into my memory. Perhaps because during this eventful trip, I unconsciously "felt" my father's personality. All of it, combined. All at once. Fed into me, compressed, in just a few hours, to be kept for a lifetime, to be deciphered, unraveled and admired forever.

My father loved the Deccan. Although, it is unfair to put it thus. His relationship with Hyderabad and its surroundings transcends description provided by the sentence. It involved a deep attachment to its roots, to memory, to friends, to family, even to strangers, to the smells, to its dark granite rocks, to its lush Neem trees, to the Monsoon, to Gandipet, to Himayatsagar, to Mangoes, to the Koel, to the paddy fields, to Food, to Poetry, to the boisterous laughter that rang through the high-ceilinged halls of Waheed Manzil[1]; yet to everything that was simple, sophisticated, tasteful, mystical, joyful and Deccanni.

While he stopped, at the edge of the hill, to point out our destination to me that morning, it was perhaps not his sole intent. He gazed around him and into the distance as if to re-capture the beauty and vastness of entire landscape- the rolling hills of Anant Giri and Viquarabad. And before he mentioned words to me, he perhaps was in another world- the

[1] The big house built by my father's Grandfather Waheed Jung Bahadur.

By Jafer Ehtesham

Memories of my Father

It was a hot, dry day, as many days are during summer, in and around Hyderabad. It must have been during the month of April-May. Mangoes were in bloom and schools were on holiday. Our family was vacationing in the corrugated red hills near Viquarabad. "It is a long walk all the way," said my father, "do you think you can walk that far?" "Yes," I replied quickly, as if to not allow time for him to change his mind about taking me along. We were getting ready to hike from the hill on which stood the Siva Reddy Pet guest house to another hill that he wanted to walk to. I was not sure of where or what it was that we were going to see, I just wanted to go with him.

By the time we started, the sun was in the sky, but it was early enough. We stepped out of the back door of the guest house and immediately turned right. When we got to the edge of the hill, my father stopped and so did I. "We need to go west, that way, to that hill over there- that one," he said, pointing to a particular gentle hill with a house on top of it. It seemed far away to me. He then took my hand and started to climb downhill, skidding a bit at times but guiding me along between the bushes and shrubs and weed that spreads over the landscape. To the south, away from the narrow highway that leads to the small, sleepy town of Viquarabad, the bush gets thicker and thicker, trees get bigger, until it all turns into a forest. We never did go too deep into the forest as there was never enough reason to. It was picturesque, wild, interesting and beautiful all around the guest house and vicinity, with a big "Amrai" just below the hill, on the Eastern side. The trip this morning was too exciting an adventure for me, it was to a

to translation from Urdu into English, or English into Urdu, he used to translate from other languages also. His translation of two of the most difficult poems by T. S. Eliot, "Love Song of Alfred Prufrock" and "The Waste Land" is remarkable for its naturalness. Those who have read these poems in the original were wonderstruck at Siraj's great skill in rendering them into Urdu free verse. His last effort in this area was his translation of Iqbal's Javidnama in Urdu free verse. He wanted that this translation should be published by a good publisher because he had bestowed so much care and effort on it. I requested him that this should be done by the Iqbal Academy of Hyderabad of which he had been the president for more than ten years, and he kindly agreed to my suggestion, and this translation will soon be published here. Siraj was always thinking of widening the activity of the Iqbal Academy and strengthening its finances. He also wanted that his library should be handed over to the Iqbal Academy. His library contains a large number of English books, but the holdings include a considerable number of Urdu and Persian books, many of which are rare and not easily available now. His collection will naturally increase the value of the Academy's library, but will also keep Prof. Sirajuddin's name alive.

*****

reason. He was, in fact, a "Renaissance man", equally at home in a variety of many branches of art and literature. He was himself an opponent of "specialisation" because he believed that specialisation did more harm than good to a person's innate talent. He was equally interested in the classical literature of the languages mentioned above and for this reason he became a master of comparative criticism. He was a perceptive critic in Urdu and a creative writer as well. He wrote poetry also, but never published his poetry, nor did he participate in '*mushairas*'. He was known throughout the country for his scholarship and people like Ale Ahmad Suroor, Nisar Ahmed Farooqi and Shamsur Rahman Farooqi acknowledged his achievements. Prof. Sirajuddin himself was totally indifferent to fame and publicity, and, like most Hyderabadis, suffered from a natural shyness for which Hyderabad is known, and never liked to push himself up. When Prof Hashim Ali became Vice-Chancellor of Osmania University, he tried to persuade Siraj to accept the principal ship of one of the constituent colleges, but he always declined the offer. But Prof. Hashim Ali finally succeeded in making him agree to accept the offer by telling him "Please give up this Hyderabadi shyness", and he became the Principal of the post-graduate college, and for several years, he held this position, with great distinction. A number of literary organisations used to invite him either to preside over their meetings, or to release a new book, but he accepted the invitation very reluctantly. Prof. Sirajuddin brought to bear on anything that he said or wrote, an originality of approach, and he avoided saying anything which was stale, thus there was always a kind of freshness in whatever he said or wrote which was very appealing.

A branch of literary activity over which Prof. Sirajuddin had acquired mastery was translation. In addition

Prof. Taqi Ali Mirza
Former Professor of English
Osmania University

Prof. Syed Sirajuddin – A Tribute

The death of Prof. Syed Sirajuddin has deprived Hyderabad of an outstanding literary figure who dominated the literature and culture of the city for the last fifty to sixty years. He was associated with many literary bodies and institutions, and I do not see anyone who can take his place in the near future. He was the last representative of the golden age of Osmania University.

Prof. Sirajuddin had a remarkable flair for languages. Apart from being a master of Urdu and English languages and literature, his mastery of Persian literature was also very impressive. In addition to Hafiz and Rumi whom he knew very well he, also knew very well the poetry of poets like Saadi, Omar Khayyam, Nazeeri and Khusrau. He knew by heart thousands of couplets of these poets, and quoted them with great felicity in his writings and speeches. Prof Sirajuddin also knew many European languages. He studied French and German in India, but studied Italian in Italy where he spent one year on a Govt. of India Scholarship. He read Dante's Divine Comedy with great ease in Italian. A year's study in Italy enabled him to acquire an intimate knowledge of Italian literature and culture.

I always used to complain to Siraj about not using his gifts fully and not concentrating on any particular branch of literature or art. But it would be very unfair to his multi faceted personality to accuse him of dilettantism for this

Iqbal Review

Special Issue : Prof. S. Sirajuddin Number
November – 2006

English Section

Contents

I. Prof. Sirajuddin – A Tribute Prof. Taqi Ali Mirza - 02
II. Memories of My Father Jafer Ehteshamuddin - 05

Essays of Prof. S. Sirajuddin

I. An Approach to the Reading of Iqbal's Poetry -15
II. A Poet's Significance : Iqbal and the Third World -27
III. Landscape in Javidnameh -37

Poetic Tribute

I. From Ventilator to Morgue Prof. S. K. Kumar -42
II. (i) Loss Juhi Farooqui (Age 12) -44
(Grand daughter of Prof. Siraj)
(ii)Forever Missing You " " " " " " " -45